پریم چند

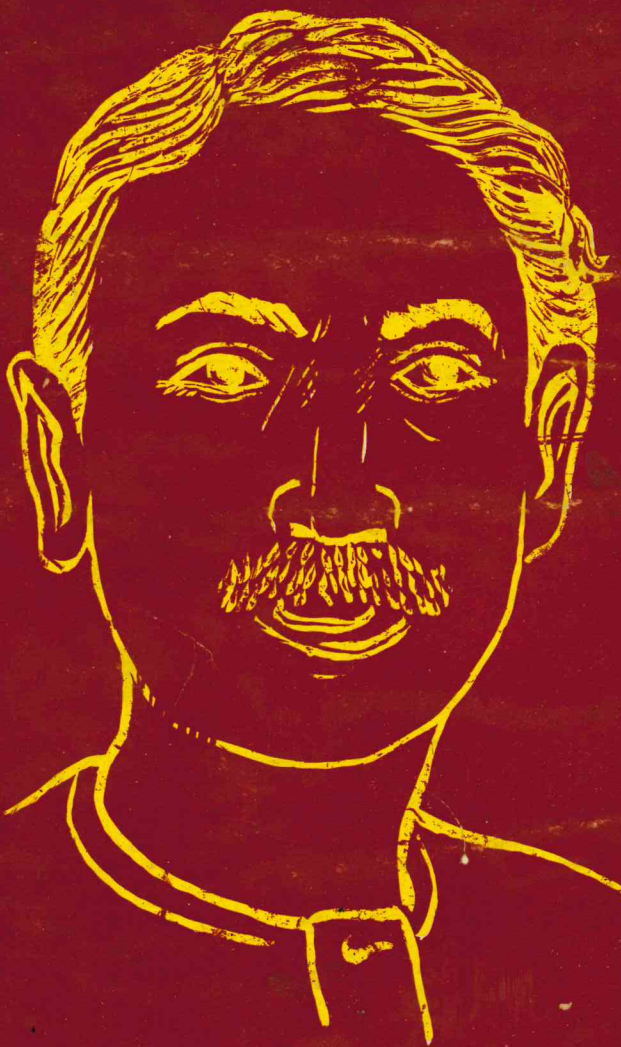

920.83
QAM
U

ڈاکٹر قمر رئیس

CHECKED 2018

پریم چند

پریم چند

CHECKED-2006

ڈاکٹر قمر رئیس

ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

920.83 U
QAM
Biography — Novelist

Prem Chand

© ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

پہلا اڈیشن : جنوری، مارچ 1985 ——— شک 1906

تعداد : 2000

قیمت : 11/50 روپے

سلسلۂ مطبوعات : ترقی اردو بیورو 461

کتابت : سہیل احمد ملک

G 700
8238
CHECKED 2002

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر۔ کے۔ پورم ، نئی دہلی 110066

طابع : اے۔ جے۔ پریس بہادر شاہ ظفر مارگ ، نئی دہلی

پیش لفظ

کوئی بھی زبان یا معاشرہ اپنے ارتقار کی کس منزل میں ہے، اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقار کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی ہے۔ ترقی پذیر معاشروں اور زبانوں میں کتابوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ سماجی ترقی کے عمل میں کتابیں نہایت موثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اُردو میں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت ہند کی جانب سے ترقی اُردو بیورو کا قیام عمل میں آیا جسے ملک کے عالموں، ماہروں اور فن کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے

ترقی اُردو بیورو معاشرہ کی موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر اب تک اُردو کے کئی ادبی شاہکار، سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کر چکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بیورو سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت نسبتاً کم رکھی جاتی ہے تاکہ اُردو والے ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔

زیر نظر کتاب بیورو کے اشاعتی پروگرام کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید کہ اُردو حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائریکٹر ترقی اُردو بیورو

فہرست

حرف آغاز	7
پہلا باب	9
دوسرا باب	16
تیسرا باب	23
چوتھا باب	33
پانچواں باب	41
بڑے بھائی صاحب (افسانہ)	57
کتابیات	67
پریم چند کی تصانیف	68

حرف آغاز

اردو اور ہندی دونوں زبانیں منشی پریم چند اور ان کے کارناموں پر فخر کرتی ہیں۔ وہ بلاشبہ ان زبانوں کے سب سے ممتاز اور ہر دل عزیز افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے دونوں زبانوں میں مختصر افسانہ نگاری کو رواج دیا اور اپنی لگاتار محنت سے افسانہ کے فن کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ اسی طرح انھوں نے اپنے ناولوں کو بھی آزادی، انصاف اور انسانی حقوق کے لیے ہندوستانی عوام کی جدوجہد کا ترجمان بنایا۔ انھوں نے حقیقت نگاری کی جس روایت کو پروان چڑھایا اُس نے اردو اور ہندی کے کم و بیش تمام ادیبوں کو متاثر کیا۔

پریم چند کی وطن پرستی اور انسان دوستی کے آدرش بھی نوجوان ادیبوں کو عزیز رہے ہیں۔ پریم چند کا عقیدہ تھا کہ قومی آزادی اور قومی یک جہتی ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ قومی اتّحاد ہی ہمیں آزادی دلا سکتا ہے اور اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اس لیے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں ہمیشہ انھوں نے قومی اتّحاد پر زور دیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مذہبی، نسلی، بھاشائی اور علاقائی فرق کے باوجود تمام ہندوستانی ایک قومی اکائی کا درجہ رکھتے ہیں۔ پریم چند نے اسی لیے اپنی زندگی کے ہر دور میں اُن قوتوں کے خلاف جہاد کیا جو ہندوستان کی آزادی، اتّحاد اور یک جہتی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

پریم چند نے ہندوستان کے محنت کش عوام کی زندگی کا مطالعہ بڑی گہرائی اور دردمندی سے کیا تھا، خاص طور سے گاؤں کی زندگی اور اس کے مسائل کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا

تھا۔ آزادی سے پہلے کے ہندوستان کی حقیقی زندگی کو جاننے اور سمجھنے کے لیے پریم چند کے ناول اور افسانے ہی سب سے معتبر ذریعہ ہیں۔

پریم چند جانتے تھے کہ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ اس کے مختلف علاقوں میں لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ ان کی معاشرت میں بھی ظاہری طور پر کچھ فرق ہے۔ اس کے باوجود تاریخی طور پر ان کی تہذیب کی بنیادیں ایک ہیں۔ ان کی زبانوں نے ایک ہی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اپنے مسائل بھی ایک جیسے ہیں۔ اس لیے پریم چند نے اپنے رسالے 'ہنس' میں پہلی بار 'ہندوستانی ادب' کا تصوّر پیش کیا۔ انھوں نے ہندوستان کی تمام زبانوں کے اعلیٰ ادب کو ترجمہ اور تعارف کے ساتھ شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ اور اس طرح ذہنی اور جذباتی یک جہتی کے لیے انھوں نے مشترکہ قومی تہذیب اور قومی ادب کی تعمیر پر زور دیا۔ مہاتما گاندھی کی طرح پریم چند بھی اردو ہندی دونوں زبانوں کو عزیز رکھتے تھے۔ انھوں نے دونوں زبانوں کو قریب لاکر ایک مشترکہ قومی زبان کو رواج دینے کی کوششیں کیں۔

الغرض پریم چند کے افسانے اور ناول اور قومی مسائل کے بارے میں ان کے خیالات آج کے دور میں بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ نئی پیڑھی کے بچّے اور جوان بھی انھیں دلچسپی اور شوق سے پڑھیں۔ یہ کتاب بھی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر پیش کی جارہی ہے۔

قمر رئیس

پہلا باب

پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا لیکن گھر میں سب انھیں پیار سے نواب یا نواب رائے کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کا خاندان بنارس سے چار پانچ میل دور 'لمہی' نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا۔ پریم چند اسی گاؤں میں ۳۱ر جولائی ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے۔

ان کے والد منشی عجائب لال ڈاکخانہ میں ملازم تھے۔ تنخواہ لگ بھگ بیس روپیے ماہوار ملتی تھی۔ ملازمت کے علاوہ کچھ کھیتی باڑی بھی تھی۔ الغرض اچھی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی۔

دھنپت رائے نے دیہات کے کھلے ہوئے آزاد ماحول میں آنکھیں کھولیں اور بچپن کا بڑا حصّہ فطرت کے اسی آغوش میں گزارا۔ مشترکہ خاندان تھا۔ اپنے چچازاد بھائیوں اور ہمجولیوں کے ساتھ وہ بڑے پیار و محبّت سے رہتے تھے۔ شرارتیں بھی کرتے تھے۔ کچھ بڑے ہوئے تو گلی ڈنڈا کھیلنے لگے۔ ان کی بیوی شورانی دیوی نے اپنی کتاب میں ان کے بچپن کی ایک شرارت کا ذکر کیا ہے۔

ایک بار سب بچّے حجام کا کھیل کھیل رہے تھے۔ نواب رائے کو شرارت سوجھی اور انھوں نے ایک بچّے کی حجامت بناتے ہوئے اس کے کان کا ایک حصّہ کاٹ دیا۔ وہ روتا اور بلبلاتا ہوا اُن کی ماں کے پاس پہنچا۔ ماں نے نواب کو بلا کر پوچھا تو انھوں نے جھوٹ بول کر اپنے جرم پر پردہ نہیں ڈالا بلکہ یہ کہہ کر اعتراف کر لیا۔ "سبھی تو اسی طرح کھیل رہے تھے۔" اس حرکت پر انھیں ماں

کے طمانچے کھانا پڑے۔

پانچ سال کی عمر میں دھنپت رائے ایک مدرسہ میں پڑھنے کے لیے بٹھا دیے گئے۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق سب بچّے اردو اور فارسی پڑھتے تھے۔ خاص طور پر کائستھ خاندان کے بچّوں کو اردو اور فارسی پڑھنے کا زیادہ شوق تھا۔ دھنپت رائے کا مکتب پڑوس کے ایک گاؤں میں تھا۔ یہ ایک مولوی صاحب کے گھر کی ڈیوڑھی تھی۔ مولوی صاحب جن بچّوں کو پڑھاتے تھے وہ انھیں فصلی ترکاریاں، پھل اور اناج اپنے گھر سے لاکر دیتے تھے۔ دھنپت رائے کبھی کبھی مکتب جانے کے بجائے باغوں اور کھیتوں میں گھوم پھر کر گھر آجاتے۔ گنّے چوستے، مٹر کی پھلیاں کھاتے اور کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف نکل جاتے تو ریل کا نظارہ کرتے۔

پریم چند نے مکتب سے زیادہ اپنے آس پاس کی زندگی اور ماحول سے علم و تجربہ حاصل کیا۔ اگر ایک طرف وہاں لہلہاتے ہوئے کھیت، پھلوں سے جھومتے ہوئے باغ، دور تک پھیلی ہوئی ہریالی، دریا اور تالاب تھے تو دوسری طرف گاؤں کی غلاظت، کسانوں کی غربت، ان کے گرے پڑے مکانات اور گاؤں کے صدیوں پرانے رسم و رواج تھے۔ گاؤں کی زندگی سے جو تعلق خاطر پریم چند کو اس زمانہ میں پیدا ہوا وہ ہمیشہ قائم رہا۔

دھنپت رائے کی عمر مشکل سے سات آٹھ سال کی ہوگی جب اُن کی ماں آنندی دیوی چھ مہینے تک بیمار رہ کر چل بسیں۔ وہ اُس وقت ناسمجھ تھے۔ انھیں احساس نہیں ہوا کہ کتنا بڑا سانحہ اُن کے ساتھ ہوا ہے۔ بعد میں ماں کی انمول محبّت اور مامتا کو یاد کرکے وہ اکثر تنہائی میں روتے تھے۔ ماں سے محبّت سے محرومی کا یہ غم ان کی کہانیوں میں بھی جھلکتا ہے۔ ماں کی موت کے بعد ان کی پرورش

دادی نے کی۔ جو ہر رات انھیں پریوں اور شہزادوں کی دلچسپ کہانیاں سناتی تھیں۔ دھنپت رائے یہ کہانیاں بڑے اشتیاق سے سنتے۔ کچھ عرصہ بعد جب ان کے والد کا تبادلہ گورکھپور ہوگیا تو وہاں بھی داستانیں سننے کا یہ مشغلہ جاری رہا۔ ان کے ایک دوست فراق گورکھپوری لکھتے ہیں۔

"پریم چند نے مجھے بتایا کہ لڑکپن میں ان کی دوستی اپنے درجہ کے ایک لڑکے سے ہوگئی جو ایک تمباکو فروش کا بیٹا تھا۔ روزانہ وہ اپنے کم عمر دوست کے ساتھ اسکول کے بعد اس کے مکان پر جاتے تھے وہاں تمباکو کے بڑے بڑے سیاہ پنڈوں کے پیچھے تمباکو فروش اور اس کے احباب بیٹھ کر برابر حقہ پیتے اور "طلسم ہوشربا" پڑھتے تھے۔ یہاں پریم چند اپنے کم سن دوست کے ساتھ بیٹھ کر "طلسم ہوشربا" کے افسانے سنتے تھے۔ یہاں تک کہ شام ہوجاتی جب وہ اپنے گھر چلے جاتے۔"

قصہ کہانیوں سے پریم چند کی دلچسپی کا آغاز شاید اسی طرح ہوا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ لڑکپن ہی میں انھوں نے ناولوں افسانوں کا وہ تمام ذخیرہ پڑھ ڈالا جو اردو میں ملتا تھا۔ لکھتے ہیں۔

"اس وقت میری عمر کوئی تیرہ سال ہوگی۔ ہندی بالکل نہ جانتا تھا۔ اردو کے ناول پڑھنے کا جنون تھا ..... ریتی پر ایک کتب فروش بدھی لال رہتا تھا اس کی دوکان پر جا بیٹھتا تھا۔ اس کے اسٹاک سے ناول لے لے کر پڑھتا تھا۔ مگر دکان پر سارے دن تو بیٹھ نہ سکتا تھا اس لیے میں اس کی دوکان سے

انگریزی کتابوں کی کنجیاں اور خلاصے لے کر اپنے اسکول کے لڑکوں کے ہاتھ بیچا کرتا تھا اور اس کے معاوضہ میں ناول گھر لاکر پڑھتا تھا اور تین برسوں میں میں نے سیکڑوں ناول پڑھ ڈالے۔"

پریم چند کو اپنے لڑکپن میں مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ۱۸۹۴ء میں جب ان کی عمر چودہ سال کی تھی ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں نے سارے گھر پر قبضہ جما لیا۔ پریم چند کی تعلیم اور تربیت میں اب نہ اُن کے باپ کو دلچسپی رہی نہ سوتیلی ماں کو۔ وہ اُس پیار اور شفقت سے محروم رہے جو اس عمر میں بچّوں کو میسّر ہوتی ہے اور جو ان کے فطری نشوونما کے لیے ضروری ہے۔

مالی پریشانیاں الگ تھیں۔ پریم چند نے لکھا ہے کہ ان کو بارہ آنے مہینہ اسکول کی فیس دینا بھی مشکل ہوتا تھا۔ جب وہ بنارس میں نویں جماعت میں پڑھتے تھے تو روز صبح کو گاؤں سے پیدل چل کر شہر آتے تھے اور شام کو پیدل گاؤں واپس جاتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے ان کی سوتیلی ماں انھیں تھوڑا سا گُڑ دے دیتی تھیں اور بس۔

پریم چند کی عمر مشکل سے پندرہ سال کی ہوگی کہ ان کے والد نے موضع رامپور ضلع بستی میں اُن کی شادی کر دی۔ ابھی تک وہ اپنی پڑھائی میں مگن رہتے تھے لیکن اب گھر کی ذمہ داریاں بھی آپڑیں۔ اور ذہنی الجھنوں میں اضافہ ہوگیا۔ بیوی اُن کو پسند نہیں تھی۔ پھر آئے دن سوتیلی ماں سے اس کے جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ ان کی شادی کو ایک سال ہی گزرا تھا کہ ۱۸۹۷ء میں ان کے والد چند ماہ بیمار رہ کر چل بسے۔ اب گھر کی ساری ذمّہ داریاں دھنپت رائے کے سر پر آپڑیں۔ اُس زمانہ کی حالت کا

نقشہ وہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

"گھر میں، میں، میری بیوی، سوتیلی ماں اور ان کے دو لڑکے تھے مگر آمدنی ایک پیسہ کی نہ تھی۔ گھر میں جو کچھ تھا چھ ماہ تک والد کی علالت اور ان کی تجہیز و تکفین میں خرچ ہو گیا۔ مجھے ایم۔اے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تھا۔ ملازمت اُس زمانہ میں بھی اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کر کے دس بارہ روپیے (مہینے) کی جگہ پا جاتا۔ مگر یہاں تو آگے بڑھنے کی دھن تھی۔"

انھوں نے ہمّت نہیں ہاری اور ساری پریشانیوں کے باوجود میٹرک کا امتحان دوسرے درجہ میں پاس کر لیا۔

وہ آگے پڑھنا چاہتے تھے لیکن تنگ دستی اور گھر کی ذمّہ داریاں راستہ روکے کھڑی تھیں۔ پانچ روپیے مہینہ کی ٹیوشن کر کے کسی طرح گزارا کرتے رہے۔ کبھی اپنی عزیز کتابیں اور کوٹ بیچ کر بھی انھوں نے اپنی ضروریات پوری کیں۔ لیکن انھیں تو ایک پورے گھر کا بار اُٹھانا تھا۔

آخر خوش قسمتی سے انھیں بہرائچ کے ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر کی جگہ مل گئی۔ اٹھارہ روپیے مہینے کی اس عارضی نوکری سے انھیں بڑا سہارا ملا۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ اسکول پرتاب گڈھ میں ان کا تقرر ہو گیا جہاں سے انھیں ٹریننگ کے لیے الہ آباد بھیج دیا گیا۔

ٹریننگ کالج میں وہ جولائی ۱۹۰۲ء سے اپریل ۱۹۰۴ء تک رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مطالعہ کے ساتھ ساتھ انھیں اردو میں لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا۔ بنارس سے ایک ہفتہ وار اخبار

"آوازِ خلق" نکلتا تھا۔ انھوں نے "اسرارِ معابد" کے نام سے ایک ناول لکھنا شروع کیا۔ اس کی پہلی قسط اسی اخبار میں اکتوبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء تک دوسری کئی قسطیں چھپیں۔ یہ پہلا ادھورا ناول "منشی دھنپت رائے عرف نواب رائے" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے رتن ناتھ سرشار کے مقفّیٰ طرزِ تحریر کی پیروی کی ہے۔ ٹریننگ کالج میں دھنپت رائے کے ایک ہم جماعت بابو کرشن لال تھے۔ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے دھنپت رائے کی اس زمانے کی زندگی کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"جس طرح اُن کی وضع قطع سادہ تھی عادتیں اور اخلاق بھی سیدھا سچّا اور تصنّع سے بالاتر تھا۔ خلوص آپ کا ہمیشہ سے شعار تھا۔ آواز بلند تھی اور خواہ مخواہ کسی سے دبنے والے آدمی نہ تھے۔ ہوسٹل میں کسی سے لڑنا جھگڑنا درکنار انھیں کبھی کسی سے ناملائم یا خلاف تہذیب گفتگو کرتے بھی نہیں دیکھا گیا۔ پڑھتے لکھتے وقت اکثر اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا کرتے اور تفریح کے وقت دل کھول کر تفریح کرتے۔ جب ہنستے تو خوب ہنستے اور قہقہے لگاتے چلے جاتے۔ اس وجہ سے ہم لوگ اور خاص کر یہ احقر اور گرجا کشور ان کو "بمبوق" کہا کرتے تھے۔"

یہ پریم چند کی جوانی کی تصویر ہے۔ لیکن جن لوگوں نے انھیں آخر عمر میں دیکھا ان کا کہنا ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی ایسی ہی سادگی اور جانفشانی کی زندگی بسر کرتے تھے اور جی کھول کر ہنستے تھے۔

ٹریننگ مکمّل کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ تک الہ آباد میں رہے اور پھر مئی ۱۹۰۵ء میں

ان کا تبادلہ کانپور کا ہوگیا۔ یہاں تیس ۳۰ روپیے ماہوار پر وہ گورنمنٹ ڈسٹرکٹ اسکول میں ٹیچر ہوگئے۔

اس زمانہ میں کانپور سے 'زمانہ' نام کا ایک رسالہ نکلتا تھا۔ اس کے اڈیٹر دیا نرائن نگم تھے۔ دھنپت رائے انھیں پہلے ہی سے جانتے تھے۔ کانپور پہنچ کر ان سے دوستی ہوگئی اور پھر یہ دوستی ہمیشہ قائم رہی۔ اپنے دوست نگم کے کہنے پر وہ ان کے 'زمانہ' کے لیے پابندی سے مضامین اور افسانے لکھنے لگے۔ یہاں ان کی دوستی اُس زمانہ کے کچھ دوسرے بڑے ادیبوں مثلاً درگا سہائے سرور اور نوبت رائے نظر سے ہوگئی۔ دراصل یہ وہ زمانہ ہے جب سارے ملک میں ایک بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ انگریزوں کی غلامی سے آزادی اور وطن دوستی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں انگڑائی لینے لگے تھے۔ دھنپت رائے بھی ان خیالات سے متاثّر ہوئے۔ انھوں نے وطن کی محبّت کے جذبات کو کئی کہانیوں میں پیش کیا اور ان کہانیوں کا مجموعہ ۱۹۰۸ء میں "سوزِ وطن" کے نام سے کانپور سے شائع کرایا۔ جب انگریز حاکموں کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے پریم چند کو بلایا اور کہا کہ تمھاری کہانیوں میں حکومت سے بغاوت پر اکسایا گیا ہے اس لیے یہ کتاب ضبط کی جاتی ہے۔ انگریز افسر نے ان کے سامنے ہی ان کی کتابیں جلا دیں جس کا انھیں بہت افسوس ہوا۔

یہ کتاب نواب رائے کے نام سے چھپی تھی۔ انگریز حاکم اب جان گئے تھے کہ دھنپت رائے کا ایک نام نواب رائے بھی ہے۔ اس لیے اب وہ ان دونوں ناموں سے نہیں لکھ سکتے تھے۔ ان کے دل میں وطن کی محبّت اور آزادی کے ایسے جذبات اور خیالات تھے جن کو وہ پڑھے لکھے لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اسی زمانہ میں ان کے دوست دیا نرائن نگم نے مشورہ دیا کہ وہ پریم چند کے نام سے لکھا کریں۔ جسے انھوں نے پسند کیا۔

دوسرا باب

پریم چند کے نام سے دھنپت رائے کی پہلی کہانی "بڑے گھر کی بیٹی" دسمبر ۱۹۱۰ء میں 'زمانہ' میں شائع ہوئی۔ اور اس طرح اردو ادب میں پریم چند کا جنم ہوا۔ اس سے پہلے ان کی آٹھ نو کہانیاں چھپ چکی تھیں۔ لیکن ان میں بہت سی کمزوریاں تھیں اور وہ پڑھنے والوں کو زیادہ متاثر نہیں کرتی تھیں لیکن 'بڑے گھر کی بیٹی' ان سے بہت مختلف اور موثر کہانی تھی جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ شریف گھرانے کی لڑکی سسرال میں جاکر کیسی سمجھ داری سے رہتی ہے اور اپنی محبّت اور قربانی سے کس طرح سب کا دل جیت لیتی ہے۔

اس طرح پریم چند کے نام سے ان کی زندگی اور افسانہ نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اردو اور ہندی میں اس نام سے اتنی شہرت پائی کہ زیادہ تر لوگ ان کا اصلی نام بھول گئے۔

جون ۱۹۰۹ء میں پریم چند سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوکر کانپور سے مہوبہ ضلع ہمیرپور چلے گئے۔ وہاں ان کا کام گاؤں گاؤں جاکر اسکولوں کا معائنہ کرنا تھا۔ اس طرح ایک بار پھر انھیں گاؤں کی زندگی اور قدرت کے کھلے مناظر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ وہ جنگلوں اور پہاڑوں کی سیر کو نکل جاتے تھے اور وہاں پورا پورا دن بسر کرتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے گاؤں کی زندگی کے بارے میں کہانیاں لکھنا شروع کیں۔

اب تک پریم چند کی زندگی بڑی پریشانی اور تنہائی میں گزر رہی تھی۔ شادی کے بعد بیوی سے ان کی نہیں بنتی تھی اور وہ انھیں پسند بھی نہیں تھی۔ ایک بار وہ لڑ جھگڑ کر اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی۔ پریم چند نے پھر اسے نہیں بلایا اور ایک بیوہ سے جس کا نام شورانی دیوی تھا انھوں نے دوسری شادی کر لی۔ جب مہوبہ آئے تو دوسری بیوی شورانی کو بھی پاس بلا کر رکھا۔ اس طرح پہلی بار انھیں گھر کی آسایش اور آرام کا مزہ ملا۔ شورانی دیوی ان کا بہت خیال کرتیں۔ ان کے ساتھ سیر کو جاتیں۔ مہوبہ کا حال بیان کرتے ہوئے وہ اپنی کتاب میں لکھتی ہیں۔

"ہم لوگ جنگل کے شروع میں ہی گاڑی چھوڑ کر بھیتر چلے جاتے۔ دن بھر وہاں جھاڑیوں میں پانی پیتے۔ پھل کھاتے۔ وقت گزارتے۔ پہاڑ پر چڑھ کر پہاڑ کی بھی سیر کرتے۔ شام تک مہوبہ واپس آجاتے۔ جن کو میں پیار کرتی ان کو وہ ضرور پیار کرتے۔"

شہرت اور عزت کے ساتھ ساتھ پریم چند کو اب گھریلو زندگی کی خوشیاں بھی ملیں اور وہ سکون کی زندگی گزارنے لگے۔ لیکن اسی زمانہ میں انھیں پیچش ہوئی اور یہ مرض ان کے پیچھے لگ گیا۔ علاج کرایا لیکن فائدہ نہیں ہوا۔ تب انھوں نے تبادلہ کی کوشش کی۔ اس بار انھیں ضلع بستی بھیج دیا گیا۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں جب وہ بستی پہنچے تو برسات کی آب وہوا نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا۔ چھٹی لے کر چھ مہینے تک علاج کراتے رہے۔ اس زمانہ میں انھیں آدھی تنخواہ یعنی صرف پچیس ۲۵ روپیے مہینہ ملتے تھے۔ اس میں سے دس روپیے مہینہ وہ سوتیلی ماں کو اور پندرہ روپیے سوتیلے بھائی کو بھیجتے تھے جو جھانسی میں پڑھ رہا تھا۔ کہانیاں اور مضامین لکھ کر جو پیسہ ملتا

تھا اس میں وہ اپنی گزر بسر کرتے تھے۔ ان پریشانیوں کے ساتھ ساتھ وہ پرائیویٹ طور پر انٹر کا امتحان دینے کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ آخر کار یہ امتحان انھوں نے پاس کر لیا۔

اگست ۱۹۱۶ء میں پریم چند کا تبادلہ بستی سے گورکھپور ہو گیا۔ یہاں وہ نارمل ٹریننگ اسکول میں اُن نوجوانوں کو پڑھاتے تھے جو بعد میں ٹیچر بنتے تھے۔ اسکول کے احاطہ میں ہی رہنے کے لیے انھیں ایک کمرہ مل گیا۔ جس دن وہ گورکھپور پہنچے اسی دن ان کے بڑے لڑکے شری پت رائے کا جنم ہوا۔ یہاں کے ہیڈ ماسٹر، استاد اور طالب علم سب پریم چند سے بہت خوش تھے۔ وہ ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے۔ سب لڑکے ان کا بہت ادب کرتے تھے۔ یہاں منظور الحق کلیم نام کے ان کے ایک شاگرد تھے۔ وہ اُس زمانہ میں پریم چند کے رہن سہن کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اسکول میں عموماً ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے۔ رہنے کے لیے آپ کو اسکول ہی میں سرکاری مکان تھا۔ گھنٹہ بجا اور آپ شاعرانہ انداز میں نکلے۔ اکثر آپ کھلے سر، بال پریشان اور ایک کوٹ پہنے ہوئے جس کے بٹن کھلے رہتے۔ عام طور پر دھوتی پہنے .... لڑکے جتنا ان کا ادب کرتے تھے کسی دوسرے کا نہیں کرتے تھے۔ میری جماعت کو تاریخ پڑھاتے تھے .... کلاس میں ان کے آتے ہی ایسی زندہ دلی پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر ایک ان کی طرف مخاطب ہو جاتا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ جو سبجکٹ پڑھانا ہے وہی پڑھایا جائے بلکہ جس موضوع کی طرف ان کا رجحان یا لڑکوں کا تقاضہ ہوا بیان فرمانے لگے۔ اگر کلاس میں پڑھاتے وقت کوئی ہنسی کی بات آ گئی تو بے اختیار ہنسنے لگتے۔"

پریم چند کے رہائشی کمرہ کے سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ اب اس جگہ پر پتھر کا ایک چبوترا بنوا دیا گیا ہے۔ اس کمرہ پر "پریم چند سدن" نام کی تختی بھی لگوا دی گئی ہے۔ سامنے ایک چھوٹا سا پارک ہے جس میں پریم چند کی مورتی بھی لگا دی گئی ہے۔

اب تک پریم چند اپنے افسانے اور ناول اردو میں لکھتے تھے۔ یہاں مہاویر پرشاد دویدی اور ہندی کے دوسرے ادیبوں سے پریم چند کی دوستی ہو گئی۔ انھوں نے پریم چند کو ہندی میں لکھنے کی رائے دی۔ اس طرح وہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی لکھنے لگے۔

اردو میں پریم چند کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'پریم پچیسی' (حصہ اوّل) ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا حصہ ۱۹۱۸ء میں چھپا۔ اس میں پریم چند کی بعض مشہور کہانیاں مثلاً نمک کا داروغہ۔ بے غرض محسن۔ خون سفید اور "صرف ایک آواز" شامل ہیں۔ یہ کہانیاں گاؤں کی سیدھی سادی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب تک اردو زبان میں کسی بھی ادیب نے ہندوستان کے گاؤں کے بارے میں افسانے یا ناول نہیں لکھے تھے۔ اس کی طرف سب سے پہلے پریم چند نے دھیان دیا۔ انھوں نے کسانوں کی غریبی۔ ان پر ہونے والے ظلم اور چھوت چھات کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی اور بتایا کہ ہندوستانی سماج کو ان برائیوں سے پاک ہونا چاہیے۔ اسی زمانہ میں پریم چند نے ایک ناول "بازارِ حسن" لکھا۔ جس کی پہلی جلد ۱۹۲۱ء میں اور دوسری جلد ۱۹۲۲ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس ناول میں انھوں نے دکھایا ہے کہ ہندوستانی سماج میں عورتوں پر جو ظلم ہوتا ہے اس کا نتیجہ کبھی کبھی کتنا خوفناک ہوتا ہے۔

یہ ناول اور اُن کی کہانیوں کے دو مجموعے ترجمہ ہو کر ہندی میں بھی شائع ہوئے۔ اس طرح اردو کے ساتھ ساتھ ہندی پڑھنے والوں میں بھی ان کی شہرت پھیل گئی۔ سارے ملک میں لوگ ان کو جاننے لگے اور ان کی کہانیاں پڑھنے کے لیے بے چین رہنے لگے۔ اس لیے اس زمانہ میں پریم چند زیادہ لگن اور محنت سے کہانیاں لکھنے لگے۔

۱۹۲۰ء میں ان کی کہانیوں کا نیا مجموعہ "پریم بتیسی" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی بعض کہانیوں نے بڑی شہرت حاصل کی مثلاً بوڑھی کاکی اور حج اکبر۔ یہ کہانیاں اردو کے رسالوں، زمانہ۔ کہکشاں۔ صبح امید اور بہارستان وغیرہ میں شائع ہوئیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ پریم چند اپنے وطن سے بڑی محبّت کرتے تھے۔ وہ انگریزوں کی غلامی سے دکھی تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ملک آزاد ہو۔ انگریز ہندوستانی عوام پر جو ظلم کرتے ہیں اُس سے چھٹکارا ملے۔ اُس زمانہ میں انڈین نیشنل کانگریس ہی ایک ایسی سیاسی جماعت تھی جو عوام کے مطالبات حکومت سے منوانے کی کوشش کرتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ لوگوں کے دلوں میں ملک وقوم کی محبّت اور آزادی کے جذبات بھی پیدا کر رہی تھی۔

۱۹۱۴ء سے دنیا میں ایک بڑی جنگ ہو رہی تھی۔ انگریز بھی اس میں شریک تھے۔ آخر کار ۱۹۱۸ء میں یہ جنگ ختم ہو گئی۔ جنگ کے زمانہ میں انگریزوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی وہ ہندوستانیوں کو حکومت کرنے کے کچھ اختیارات دیں گے اور اس طرح انھیں کچھ آزادی بھی ملے گی۔ لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد انھوں نے ایک ایسا قانون نافذ کرنا چاہا جس کا مقصد آزادی کے اندولن کو دبانا اور ہندوستانی عوام پر من مانے ظلم کرنا تھا۔

مہاتما گاندھی اُس زمانہ میں آزادی کے اندولن کے رہنما ہو گئے تھے۔ سب ان کی عزت کرتے تھے۔ انھوں نے انگریزوں کی اس پالیسی کے خلاف سارے ملک میں یوم احتجاج منانے کا اعلان کیا۔ لاکھوں لوگوں نے ہڑتالیں کیں۔ جلوس نکالے۔ جلسے ہوئے۔ پولس نے ان پر لاٹھیاں برسائیں۔ لیکن وہ پُر امن رہے۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں شہر کے سیکڑوں لوگ جمع ہو کر بیساکھی کا تہوار منا رہے تھے۔ اچانک ایک انگریز افسر، پولس کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور اُس نے نہتّے لوگوں پر گولیاں برسانے کا حکم دیا۔ سیکڑوں آدمی مارے گئے۔ ان میں بچّے اور عورتیں بھی تھیں۔ جب اس واقعہ کی خبر پھیلی تو سارے ملک میں غم اور غصّے کی ایک لہر دوڑ گئی۔

اس کے بعد ہی مہاتما گاندھی نے ستیہ گرہ، سول نافرمانی اور بائیکاٹ کا اندولن شروع کیا۔ اس کا مطلب تھا لوگ انگریزی حکومت کا ساتھ نہ دیں۔ اس اندولن میں ہزاروں طالب علموں نے سرکاری اسکولوں کا بائیکاٹ کیا۔ سرکاری ملازموں نے بہت بڑی تعداد میں اپنے عہدوں سے استعفےٰ دے دیے۔ بدیسی چیزوں کا بھی بائیکاٹ کیا گیا۔ اس اندولن میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی سب مل کر حصّہ لے رہے تھے۔ آپس میں زبردست اتّحاد تھا۔ ہر ایک کے دل میں آزادی حاصل کرنے کا سچّا جوش تھا۔

پریم چند اور ان کی بیوی شورانی کے دل میں بھی آزادی کے جذبات مچل رہے تھے۔ پریم چند سرکاری ملازم تھے۔ وہ بھی استعفیٰ دے کر آزادی کے اندولن میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ وہ گورکھپور میں تھے۔ فروری کا مہینہ تھا جب مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا۔ اس

جلسہ کا حال پریم چند اس طرح لکھتے ہیں۔

"غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا۔ دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ کیا شہر کیا دیہات، عقیدت مند پبلک دوڑی آتی تھی۔ ایسا مجمع میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی میں بھی جان آ گئی۔ اس کے دو ہی چار دن بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔"

تیسرا باب

پریم چند کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا استعفیٰ ۱۵ر فروری ۱۹۲۱ء کو منظور ہو گ
تھا۔ اس طرح سرکاری نوکری کی زنجیر سے انھیں چھٹکارا ملا۔ جس مہینے میں انھوں نے استعفیٰ دیا اُ
مہینہ میں ان کا ایک ناول "گوشۂ عافیت" ہندی میں "پریم آشرم" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ نا
پریم چند نے اردو ہی میں لکھا تھا لیکن اس کا ہندی ترجمہ اردو سے پہلے چھپ گیا۔ اس ناول میں
انھوں نے زمینداروں اور انگریزی حکومت کے ظلم کے خلاف غریب کسانوں کی بغاوت دکھا
ہے۔ اُس زمانہ میں زمیندار اور پولس کے افسر کسانوں سے بیگار اور رشوت لیتے تھے۔ انھیں طر
طرح سے لوٹتے تھے اور ان کی بے عزّتی کرتے تھے۔ ناول میں کسان منوہر اور اس کا بیٹا بلراج اس
ظلم اور بے عزّتی کے خلاف آندولن چلاتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ پڑوسی دیس روس میں انقلاب کے
بعد ۱۹۱۷ء میں کسانوں اور مزدوروں کا راج قائم ہو چکا ہے۔ وہاں ظلم کرنے والے زمینداروں او
پولس افسروں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ بلراج گاؤں کے بوڑھوں سے کہتا ہے۔

"تم لوگ تو ایسی ہنسی اڑاتے ہوں جانوں کا سکار کوئی چیج ہی نہیں۔ وہ
جمیندار کی گلامی کرنے کے لیے بنایا گیا ہے لیکن ٹھاکر چچا کے گھر جو اکبار آتا ہے
اس میں لکھا ہے کہ روس دیس میں کاسکاروں ہی کا راج ہے۔ وہی جو چاہتے ہیں

کرتے ہیں۔"

روس دیس میں سماج واد قائم ہوگیا تھا۔ پریم چند بھی دھیرے دھیرے سماج واد کو ماننے لگے تھے۔ اور وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کے کسان اور مزدور لوٹ کھسوٹ اور ظلم سے چھٹکارا پانے کے لیے اسی راستہ پر آگے بڑھ رہے تھے۔

نوکری چھوڑ دی لیکن پریم چند کے سامنے اب سوال یہ تھا کہ گزر بسر کیسے ہو؟ جس آمدنی سے سارا گھر چلتا تھا وہ بند ہوگئی تھی۔ لیکن پریم چند جانتے تھے کہ ملک کے دوسرے لاکھوں آدمیوں کی طرح انھیں بھی آزادی کے لیے قربانیاں دینا ہوں گی۔ تکلیفیں بھی اٹھانا ہوں گی۔ اس کے لیے وہ اور ان کی بیوی شورانی دیوی پہلے سے تیار تھے۔

اب پریم چند کانگرس کا پرچار کرنے لگے۔ وہ گاؤں گاؤں جاکر دیہات کے لوگوں کو کانگرس کے پروگرام کے بارے میں بتاتے۔ چرخے بنواکر فروخت کرتے یا لوگوں میں مفت بانٹتے۔ پھر وہ اپنے گاؤں لمہی میں جاکر رہنے لگے۔ وہاں وہ لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتے تھے اور لوگوں کو آزادی کے آندولن کے بارے میں بھی بتاتے۔

لیکن آمدنی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اتفاق سے کانپور کے ایک مارواڑی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی ضرورت تھی۔ پریم چند کے دوستوں نے انھیں اس جگہ کے لیے بلایا۔ وہ بیوی بچّوں کو ساتھ لے کر جون ۱۹۲۱ء میں کانپور پہنچ گئے اور اسکول کا کام سنبھال لیا۔ یہیں ان کا چھوٹا لڑکا بنو (امرت رائے) پیدا ہوا۔ جو آج ہندی کے مشہور ادیب ہیں۔

کچھ ہی مہینوں کے بعد اسکول کے منیجر کاشی ناتھ سے ان کا جھگڑا ہوگیا۔ وہ پریم چند کو

آزادی کے ساتھ کام نہیں کرنے دیتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات میں دخل دیتا تھا۔ پریم چند اس آئے دن کی تکرار سے تنگ آ گئے۔ اور اسکول کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔

پریم چند کے چھوٹے بھائی مہتاب رائے بنارس میں تھے۔ بنارس میں ایک کرایہ کا مکان لے کر وہ ان کے ساتھ رہنے لگے۔ مہتاب رائے گیان منڈل میں ملازم تھے۔ جہاں سے 'آج' نام کا ایک اخبار نکلتا تھا۔ پریم چند اس کے لیے مضامین اور افسانے لکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں پریم چند کو کاشی ودیا پیٹھ میں کام مل گیا۔ یہاں ان کے ایک طالب علم منمتھ ناتھ گپت تھے (جو بعد میں ہندی کے مشہور ادیب ہوئے) انھوں نے لکھا ہے کہ 'پریم چند اپنے طالب علموں میں بہت مقبول تھے۔ جغرافیہ پڑھاتے تھے جو ان کی زبان سے بہت دلچسپ ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی کہانیوں کے متعلق سوچتے ہوئے اتنا کھو جاتے تھے کہ اس حالت میں دیکھنے والا انھیں افیمی یا سوتا ہوا سمجھتا تھا۔ وہ اکثر اپنی اسی خیالی دنیا میں محو رہتے تھے'۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء تک پریم چند نے اپنا ایک بڑا ناول "چوگان ہستی" لکھا۔ اس کا موضوع سارے ملک میں تیزی سے پھیلنے والا آزادی کا اندولن ہے۔ پریم چند نے خود دیکھا تھا کہ گاندھی جی کی رہنمائی میں لاکھوں ہندوستانیوں نے ستیہ گرہ اور اہنسا کی لڑائی لڑی۔ اس ناول کا ایک اہم کردار سورداس ایک بھکاری ہے۔ جو گاندھی جی کا سچا چیلا ہے۔ وہ اہنسا میں یقین رکھتا ہے۔ انگریز حاکم جب کارخانہ بنانے کے لیے اس کی چھوٹی سی زمین پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس کے خلاف ستیہ گرہ کی لڑائی لڑتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں اس لڑائی میں جان دے دیتا ہے۔

پریم چند کا یہ ناول بھی ہندی میں چھپا۔ اور بے حد پسند کیا گیا۔ اس نے پریم چند کی شہرت

میں چار چاند لگا دیے۔ الور کے مہاراجہ نے پڑھا تو بہت متاثر ہوئے۔ ان کی طرف سے پریم چند کو چار سو روپیے ماہوار کا پرائیویٹ سکریٹری کا عہدہ پیش ہوا۔ اس کے ساتھ ہی موٹر اور بنگلہ بھی ملتا۔ پریم چند اسے منظور کر لیتے تو زندگی عیش و آرام سے بسر کرتے۔ لیکن اُنھیں اگر عیش و آرام کی طلب ہوتی تو سرکاری نوکری سے ہی استعفیٰ کیوں دیتے۔ وہ انگریز کی غلامی چھوڑ کر ایک راجہ کی غلامی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انکار کر دیا۔

پریم چند اس زمانہ میں سخت پریشانیوں میں گرفتار تھے۔ صحت الگ خراب رہتی تھی۔ آمدنی کا کوئی خاص ذریعہ نہیں تھا۔ ان کی کتابیں جو پبلشر چھاپتے تھے وہ انھیں بہت کم معاوضہ دیتے تھے۔ اس لیے پریم چند نے اب ایک پریس قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ خود اپنی کتابیں اس پریس سے چھاپیں۔ چھپائی کا دوسرا کام بھی کریں۔ ان کے دل میں ایک ایسا رسالہ نکالنے کا ارمان بھی تھا۔ جس کے ذریعہ وہ اپنے خیالات پوری آزادی سے پیش کر سکیں۔ لیکن پریس قائم کرنے کے لیے تو بہت سرمایہ چاہیے تھا۔ اتنا ان کے پاس نہیں تھا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے دوست فراق گورکھپوری اور اپنے چھوٹے بھائی کو بھی حصّہ دار بنایا۔ خود ساڑھے چار ہزار روپیے لگائے۔ اور اس طرح ۱۹۲۳ء میں بنارس ہی میں سرسوتی پریس کے نام سے ایک پریس قائم کر لیا۔

دوسری کتابوں کے علاوہ پریم چند نے اس پریس سے اپنے چار ناولوں "پردہ مجاز" غبن۔ میدانِ عمل اور گئودان کے ہندی اڈیشن شائع کیے۔ اس کے باوجود پریس کا خرچہ بہت تھا۔ اتنی آمدنی تھی نہیں۔ اس لیے پریس میں فائدے کے بجائے انھیں نقصان ہونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دونوں حصّہ داروں نے اپنے اپنے پیسے لے لیے۔ پریم چند اکیلے رہ گئے۔ وہ پوری ہمّت اور حوصلے سے

پریس چلاتے رہے۔ ان کا مقصد پریس سے نفع کمانا اور امیر بننا نہیں تھا۔ وہ تو اس کے ذریعہ ملک اور ادب کی کچھ خدمت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب نقصان اتنا بڑھ گیا کہ ان کے ضروری اخراجات بھی پورے نہ ہو سکے تو وہ لکھنؤ آ گئے اور گنگا پستک مالا میں نوکری کر لی۔ ایک سال تک وہ یہاں نصابی کتابوں کی تیاری کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد پھر بنارس آ گئے اور دو سال تک پریس کو چلانے کی جدوجہد کرتے رہے۔ آخر کار مجبور ہو کر انھیں پھر لکھنؤ آنا پڑا۔ اس بار انھوں نے نولکشور پریس میں نوکری کی۔ ان کے ہندی رسالے "مادھوری" کے اڈیٹر ہو گئے۔ ان کی محنت اور کوشش سے یہ پرچہ چل نکلا اور ملک میں مقبولیت حاصل کرنے لگا۔ جنوری ۱۹۲۸ء میں پریم چند نے 'مادھوری' میں موٹے رام شاستری کے عنوان سے اپنی ایک کہانی شائع کی۔ اس کہانی میں انھوں نے پرانے خیالات کے ایک جاہل اور مکّار وید کا مذاق اڑایا تھا۔ لکھنؤ کے ایک ویدجی نے سمجھا کہ کہانی میں ان کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ انھوں نے مصنّف اور پبلشر کے خلاف عدالت میں ہتک عزّت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ لیکن مقدمہ پریم چند جیت گئے۔

پریم چند نے جنوری ۱۹۳۰ء سے 'ہنس' نام کا ایک اپنا رسالہ سرسوتی پریس بنارس سے نکالنا شروع کیا۔ نومبر ۱۹۳۱ء میں وہ پھر نولکشور کی نوکری چھوڑ کر بنارس چلے گئے اور پوری توجہ سے 'ہنس' نکالنے لگے۔ جو کچھ ہی عرصہ میں ہندوستان کے معیاری ادبی پرچوں میں شمار ہونے لگا۔

اس دوران پریم چند کا ایک ناول 'نرملا'، الہ آباد کے رسالہ "چاند" میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اس ناول میں جہیز کی رسم اور اس سے پیدا ہونے والی سماجی برائیوں کو پریم چند نے بے نقاب کیا ہے۔ ایک شریف اور خوبصورت لڑکی نرملا کا باپ مر جاتا ہے۔ اس کی شادی اس لیے

ہو پاتی کہ اچھے لڑکے جہیز مانگتے ہیں۔ آخر کار اس کی ماں، مجبور ہو کر، ایک بوڑھے آدمی سے نرملا کا بیاہ کر دیتی ہے۔ پریم چند نے اس کی دکھ بھری زندگی کی تصویریں بڑے موثر ڈھنگ سے پیش کی ہیں۔ اسی زمانہ میں "بیوہ" نام سے ان کا ایک ناول شائع ہوا۔ جس میں انھوں نے ہندو سماج میں بیواؤں کی دوسری شادی پر زور دیا ہے۔ پریم چند ہندوستانی سماج کو ان بُرائیوں اور بیہودہ رسموں سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔

پچھلے سات آٹھ سال میں پریم چند کی زیادہ تر کتابیں ہندی میں شائع ہوئیں اور نئی کہانیاں بھی ہندی کے رسالوں میں چھپیں۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں انھیں پیسوں کی ضرورت تھی اور ہندی کے پبلشر انھیں زیادہ پیسے دیتے تھے۔ لیکن پریم چند اپنے اردو کے پڑھنے والوں سے بھی دور نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس لیے ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں انھوں نے کوشش کر کے اپنی کہانیوں کے تین مجموعے اردو میں شائع کرائے۔ پہلا مجموعہ تو انھوں نے خود اپنے پیسوں سے لکھنؤ سے شائع کرایا۔ وہ تین مجموعے یہ ہیں۔

۱۔ خاک پروانہ — نگار پریس۔ لکھنؤ ۱۹۲۸ء

۲۔ خواب وخیال — لاجپت رائے اینڈ سنز۔ لاہور ۱۹۲۸ء

۳۔ فردوس خیال — انڈین پریس۔ الہ آباد ۱۹۲۹ء

یہ مجموعے اردو کے حلقہ میں بہت پسند کیے گئے۔ اس کے بعد ہی ۱۹۳۰ء میں پریم چند کے چالیس افسانوں کا ایک مجموعہ "پریم چالیسی" کے نام سے لاہور سے شائع ہوا۔

ان افسانوں میں پریم چند نے ہندوستان کے قومی مسائل کو پیش کیا ہے۔ سب سے اہم

مسئلہ ہندوستان کی قومی آزادی کا مسئلہ تھا۔ سرکاری نوکری سے آزاد ہوکر پریم چند خود بھی کانگرس کے جلسوں میں حصّہ لیتے تھے اور آزادی کے اندولن میں آگے آنے اور قربانیاں دینے کے لیے لوگوں کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ ان کی کہانی "لال فیتہ" میں ہری بلاس ایک ڈپٹی مجسٹریٹ ہے۔ انگریز حاکم اس کے ذریعہ ستیہ گرہ اور آزادی کے اندولن کو کچلنے کا کام لینا چاہتے ہیں۔ اس کا دل اسے گوارا نہیں کرتا۔ آخر کار وہ سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیتا ہے اور پریم چند کی طرح اپنے گاؤں میں جاکر آزادی کے اندولن میں شریک ہو جاتا ہے۔

اس زمانہ میں پریم چند نے "سوا سیر گیہوں" اور "پوس کی رات" جیسی کہانیاں لکھ کر گاؤں کے کسانوں کی غریبی اور دکھ بھری زندگی کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء تک سارے ملک میں ستیہ گرہ سول نافرمانی اور خلافت کے اندولن کا جو طوفان اُٹھا تھا۔ انگریز اس سے ڈر گئے تھے۔ اس لیے کہ اس اندولن میں ہندو مسلمان اور سکھ سب پوری طرح متحّد ہو گئے تھے۔ انگریز جانتے تھے کہ ان کی ایکتا بہت بڑی طاقت ہے۔ اس لیے وہ ان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرنے لگے۔ جگہ جگہ انھوں نے خود غرض مُلاّؤں اور پنڈتوں کو روپیہ دے کر ہندو مسلمانوں میں جھگڑا کرانے کی کوشش کی اور ملک میں کئی جگہوں پر فساد ہوئے۔ پریم چند کو اس سے بہت دکھ ہوا۔ انھوں نے ہندو مسلمانوں کے اتّحاد اور ایکتا کے لیے کئی مضامین لکھے۔ اور اس بات پر زور دیا کہ جب تک ہندو مسلمان ایک نہیں ہوں گے ملک کو آزادی نہیں ملے گی۔ انھوں نے بتایا کہ ہندو مسلمانوں کو دشمنوں کے خلاف مل کر جدوجہد کرنا ہوگی اور ایسا ہمیشہ سے ہوتا آرہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی آزادی کی لڑائی میں بھی ہندو مسلمانوں نے ایک ہوکر انگریزوں کا

مقابلہ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں پریم چند نے "کربلا" نام کا ایک ڈرامہ لکھا۔ کربلا کے میدان میں مسلمانوں کے محترم رہنما حضرت امام حسینؓ شہید ہوئے تھے۔ پریم چند نے ڈرامہ میں دکھایا ہے کہ جب امام حسین اور ان کے بہتّر ساتھیوں کا یزید کی فوج نے محاصرہ کرلیا تو اس وقت ایک ہندوستانی ساہس راؤ کی رہبری میں ہندوؤں کا ایک قافلہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ امام حسین سچّائی اور انصاف کے لیے ایک ظالم کی فوج سے لڑ رہے ہیں تو اس جنگ میں انھوں نے حضرت امام حسینؓ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اور وہ سب بھی کربلا کے میدان میں امام حسینؓ کے ساتھ شہید ہوگئے۔ اس طرح ظلم اور جبر کی طاقت کے مقابلہ میں ہندو مسلمانوں نے مل کر جنگ کی۔ دونوں کا خون کربلا کی مٹّی میں جذب ہوگیا۔ دراصل پریم چند یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہندوستان میں بھی آزادی اور انصاف کی لڑائی ہندو مسلمانوں کو مل کر لڑنا ہے۔ دونوں کو متّحد ہوکر اپنے وطن کے دشمنوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

استعفےٰ دینے کے بعد پریم چند اور ان کی بیوی دونوں آزادی کے اندولن میں حصّہ لے رہے تھے۔ پورے ملک میں ستیہ گرہ اور بدیسی سامان کے بائیکاٹ کی تحریک چل رہی تھی۔ اس میں حصّہ لینے والی ہزاروں عورتیں اور مرد گرفتار ہو رہے تھے۔ لوگ ہنستے ہنستے اپنے ملک کے لیے قربانیاں دے رہے تھے۔ پریم چند کی اس زمانہ کی کہانیوں چکمہ۔ جیل، آخری تحفہ، قربانی اور قاتل کی ماں، میں ہندوستان کی اس زمانہ کی تصویر صاف دکھائی دیتی ہے۔ پریم چند خود بھی جیل جانا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی صحت بہت خراب رہتی تھی اس لیے ان کی بیوی انھیں گرفتار ہونے سے روکتی تھیں۔ آخر کار ۱۰ر نومبر ۱۹۳۰ء کو خود ان کی بیوی شورانی دیوی پکیٹنگ کرتی ہوئی گرفتار کرلی گئیں اور

انھیں ڈیڑھ مہینے کی سزا ہوگئی۔ بچّے چھوٹے تھے ان کی دیکھ بھال پریم چند کو کرنا پڑی۔ بعد میں جب ایک بار پولس لاٹھی چارج میں جواہر لال نہرو کی بوڑھی والدہ محترمہ سروپ رانی نہرو بے ہوش ہوکر سڑک کے کنارے گر پڑیں تو پریم چند کو بہت غصّہ آیا اور انھوں نے اپنے دوست دیا نرائن نگم کو لکھا۔

"گورنمنٹ کی زیادتیاں ناقابلِ برداشت ہورہی ہیں پنڈت جواہر لال کی ضعیف ماں کے ساتھ کیسی بدعتیں کی گئیں۔ اب باہر رہنے میں مجھے بھی بے حیائی معلوم ہورہی ہے۔"

پریم چند اپنے رسالہ 'ہنس' کے ذریعہ بھی ملک کی بڑی خدمت کررہے تھے۔ اس میں ایسے مضامین اور ایسی کہانیاں چھاپتے تھے جو پڑھنے والوں کو آزادی کی لڑائی میں ہمّت اور حوصلہ دیتی تھیں۔ اس لیے حکومت اس رسالہ پر نظر رکھتی تھی۔ اگست ۱۹۳۲ء سے پریم چند نے ایک دوسرا ہندی ہفتہ وار "جاگرن" بھی اپنی نگرانی میں نکالنا شروع کردیا۔ اس کا مقصد بھی آزادی کے اندولن کو بڑھاوا دینا تھا۔ لیکن دونوں رسالے نقصان میں نکل رہے تھے۔ اور اب یہ نقصان بڑھتا ہی جارہا تھا۔ بعض دوستوں نے پریم چند سے کہا کہ 'جاگرن' کو بند کردیں لیکن وہ راضی نہیں ہوئے۔ اور کہا کہ جب تک بن پڑے گا نکالتے رہیں گے۔

اس زمانہ میں پریم چند نے دو ناول لکھ کر شائع کرائے۔ ایک 'پردۂ مجاز' اور دوسرا "غبن"۔ 'پردۂ مجاز' کا ہیرو چکر دھر متوسط طبقہ کا ایک نوجوان ہے۔ اس کے دل میں ملک و قوم کا درد ہے۔ آگرہ میں جب انگریزوں کی سازش سے ہندو مسلم فساد ہونے لگتا ہے تو وہ اپنی جان

کو خطرے میں ڈال کر فساد کی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ وہ ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے تیّار ہو جاتا ہے جس کی ذات بات کا پتہ نہیں اور جسے بابو جسودانند نے صرف پالا تھا۔ اس طرح وہ صرف انسانیت کی خاطر اپنی برادری اور اپنے ماں باپ سے بغاوت کرتا ہے۔ اپنے آدرشوں پر جان دینے والے اس طرح کے بہت سے کردار پریم چند نے اپنے ناولوں میں پیش کیے ہیں۔ 'غبن' ایک اصلاحی ناول ہے لیکن اس میں آزادی کے اندولن کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ رما ناول کا ہیرو متوسط طبقہ کا نمائندہ کردار ہے۔ وہ تیس روپے ماہوار کا ملازم ہے لیکن ہر ایک سے اپنی غریبی کو چھپاتا اور اپنے دولت مند ہونے کی نمائش کرتا ہے۔ اس کی بیوی جالپا بھی اس کی باتوں پر بھروسہ کر کے اس سے ایک چندن ہار کی فرمائش کرتی ہے۔ کسی طرح قرض لے کر وہ یہ فرمائش پوری کرتا ہے لیکن قرض ادا نہیں کر پاتا اور آخر کار دفتر سے غبن کر کے کلکتہ فرار ہو جاتا ہے۔ وہاں وہ پولس کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ جب اس کی بیوی جالپا کو اصل واقعہ کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنے زیور فروخت کر کے غبن کی رقم جمع کر دیتی ہے۔ پھر وہ کلکتہ پہنچ کر رما کو پولس کے جال سے نکالنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

جالپا، دیبی دین اور زہرہ کے کردار پیش کر کے پریم چند یہ دکھاتے ہیں کہ آزادی کے اندولن میں حصّہ لینے والے لوگوں کی زندگی میں بڑی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ وہ خود غرضی اور تنگ نظری چھوڑ کر انسانیت کے اعلیٰ اصولوں اور بڑے قومی آدرشوں پر ایمان لے آئے تھے۔ اور ان کی حفاظت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔ وہ قومی اتّحاد میں یقین رکھتے تھے اور قومی ترقی کے لیے اتّحاد کو سب سے اہم اور ضروری سمجھتے تھے۔

چوتھا باب

پریم چند نے ساری زندگی بڑی سادگی میں گزاری۔ وہ کسانوں اور مزدوروں کے ادیب تھے اور خود بھی ویسی ہی زندگی بتاتے تھے۔ ملک میں ان کی شہرت اور عزّت بڑھتی جا رہی تھی۔ آزادی کے اندولن میں وہ آگے آگے تھے لیکن ان کے رہن سہن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ نہ ہی ان کے دل میں کبھی اپنی ادبی ناموری کا غرور پیدا ہوا۔ علی گڑھ کے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے پریم چند کو دیکھا تھا۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ان سے ملنے اور بات چیت کرنے کا فخر مجھے حاصل ہے۔ علی گڑھ کالج نان کوآپریشن کی زد میں آچکا تھا۔ طالب علم تتر بتر ہو چکے تھے۔ پریم چند معلوم نہیں کس کام سے اُن ہی دنوں علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ اور بنگالی کوٹھی میں مقیم تھے .... پہلے پہل وہیں ملاقات ہوئی۔ تحریروں میں غمیں اور غمخوار نظر آتے ہیں۔ بات کرنے میں بے تکلّف اور شگفتہ تھے۔ کئی اور اصحاب موجود تھے۔ پریم چند سب سے ہنس بول رہے تھے۔ میں نے کہا 'منشی جی آپ اتنے گاؤں کے نہیں معلوم ہوتے جتنے خود گاؤں ہیں۔ بڑے زوروں سے ہنسے۔ پریم چند ذرا بھی خوش ہوتے تو بے ساختہ قہقہے لگاتے۔ بولے 'گاؤں نہیں گاؤں کا

گھورا کہیے'، میں نے عرض کیا 'یہی سہی۔ جب اس پر کاشی پھل کی بیلیں پھیلیں، پھول کھلے اور پھل لگے ہوں'۔ خاموش ہوگئے۔ پھر بڑی حسرت سے بولے۔ 'نہیں بھائی صاحب۔ جس بیل اور پھول پھل کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں وہ کہاں۔ میری قسمت میں بیل اور پھول نہیں بننا ہے۔ گھورے میں مل جانا ہے۔ تب کہیں جاکر شاید اس پر بیل چڑھے۔ پھول کھلیں اور پھل آئیں۔"

پریم چند نے صحیح کہا تھا۔ ملک کی آزادی کے لیے انھوں نے کیسی قربانیاں دیں لیکن آزاد ہندوستان اور اس کی ترقیوں کو نہیں دیکھ سکے۔ ان کی سادگی کے سلسلہ میں ایک واقعہ مشہور ہے۔

ہندی ساہتیہ سمیلن کا ۲۳ واں اجلاس دلّی میں ہو رہا تھا۔ پریم چند کو بھی اس میں بلایا گیا تھا۔ سمیلن میں ساہتیہ پریشد کا ایک جلسہ بھی تھا۔ پریم چند جب اس جلسہ میں پہنچے تو اُس وقت وہاں پریم چند کی ناول نگاری پر بحث ہو رہی تھی۔ جب پریم چند اپنے سیدھے سادے پرانے کپڑوں میں پنڈال میں داخل ہونے لگے تو ایک والنٹیر نے انھیں دیہاتی سمجھ کر اندر جانے سے روک دیا۔ وہ خاموشی سے پنڈال میں پیچھے ہی کہیں بیٹھ گئے۔ پلیٹ فارم پر یہ بحث ہو رہی تھی کہ پریم چند روسی ادیب ٹالسٹائی کی طرح محبّت، صلح اور امن کے فلسفہ میں یقین رکھتے ہیں یا ان کی کہانیاں ظالموں کے خلاف نفرت کا پرچار کرتی ہیں۔ آخر میں ہندی کے ادیب بال کرشن شرما نوین نے کہا کہ پریم چند پر نکتہ چینی کرنے والے مرجائیں گے لیکن وہ امر رہیں گے۔

ہندی میں پریم چند کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے تھے لیکن وہ اردو سے بھی غافل نہیں تھے۔ ۱۹۳۰ء کے ایک خط میں دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔

"... پریم چالیسی کے لیے کہانیوں کو اردو میں لانا اور آخر میں گھنٹے دو گھنٹے کانگرس کے کاموں میں مصروف رہنا میرے لیے کافی سے زیادہ ہے۔"

ان کے چالیس افسانوں کا مجموعہ 'پریم چالیسی' ۱۹۳۰ء میں ہی لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ان کی مشہور کہانیاں 'قزاقی' اور 'پوس کی رات' بھی شامل ہیں۔ قزاقی دراصل ڈاکخانہ کا ہرکارہ تھا۔ پریم چند اپنے بچپن میں اس سے بہت مانوس تھے۔ وہ بھی ننھّے پریم چند سے بڑی محبّت کرتا تھا۔ یہ کہانی انھوں نے اسی کے بارے میں لکھی ہے۔ اور بتایا ہے کہ بچپن میں قزاقی نے پریم چند کو کیوں کر متاثّر کیا تھا۔ کہانی میں لکھتے ہیں۔

"میں تمام دن بے صبری سے اس کا منتظر رہتا۔ جوں ہی چار بجتے میں بے چین ہو کر سڑک پر جا کھڑا ہوتا۔ اور تھوڑی دیر میں قزاقی کندھے پر بلّم رکھے، گھنگرو بجاتا دور سے دوڑتا دکھائی دیتا مجھے دیکھ کر وہ اور تیز دوڑنے لگتا اس سے بلّم کے گھنگرو اور زور سے بجنے لگتے..... اور ایک پل میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن بن جاتا .... تھیلا رکھتے ہی وہ ہم لوگوں کو لے کر کسی میدان میں نکل جاتا۔ کبھی ہمارے ساتھ کھیلتا۔ کبھی برہے گا کر سناتا اور کبھی کہانیاں کہتا۔ اسے چوری۔ ڈاکہ، مار پیٹ بھوت پریت کے صدہا قصّے یاد تھے۔ میں یہ قصّے سن کر حیرت آمیز سرور میں محو ہو جاتا۔"

اس زمانہ کی بہت سی کہانیوں میں پریم چند نے اپنے بچپن کے سہانے واقعات کو یاد کیا ہے۔

پریم چند اپنے ہندی رسالے 'ہنس' اور 'جاگرن' نکال رہے تھے لیکن دونوں میں نقصان ہو رہا تھا۔ پریس بھی ٹھیک سے نہیں چل رہا تھا۔ پریم چند کے بچّے اب بڑے ہو گئے تھے

اور گھر کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔ صحت کی خرابی کے باوجود وہ دن رات محنت کرتے تھے پھر بھی گزارا مشکل سے ہوتا تھا۔

۱۹۳۴ء کا یہی وہ زمانہ ہے جب پریم چند کو بمبئی کی ایک فلم کمپنی نے کام کرنے کے لیے بلایا۔ اس کمپنی نام اجنتا سینی ٹون تھا۔ اس پیش کش کا ذکر کرتے ہوئے پریم چند اپنے ایک دوست جینندر کمار کو خط میں لکھتے ہیں۔

"بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں کنٹریکٹ کی بات ہے۔ آٹھ ہزار روپیے سال میں۔ اس حالت میں پہنچ گیا ہوں جب میرے لیے ہاں کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے۔ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول کو بازار میں فروخت کروں .... وہاں سال بھر رہنے کے بعد کچھ ایسا کنٹریکٹ کرلوں گا کہ میں یہیں بیٹھے بیٹھے تین چار کہانیاں لکھ دیا کروں۔ چار پانچ ہزار روپے مل جایا کریں۔ اس سے 'جاگرن' اور 'ہنس' دونوں مزے سے چلیں گے اور پیسوں کی تکلیف ختم ہو جائے گی۔"

آخر کار پریم چند نے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ پیسہ کی تنگی کے علاوہ اس فیصلہ کی ایک وجہ اور تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ فلم کے ذریعہ ان کے خیالات ان لاکھوں کروڑوں انسانوں تک پہنچ سکیں گے جو ان کی کہانیاں اور ناول پڑھ نہیں سکتے ہیں۔ جانے سے پہلے انھوں نے اپنا ہفتہ وار رسالہ 'جاگرن' کانگرس کے لیڈر بابو سمپورنانند کو دے دیا کہ وہ اپنی ادارت میں نکالیں۔

یکم جون ۱۹۳۴ء کو پریم چند اکیلے بمبئی پہنچ گئے۔ اور اپنا کام شروع کر دیا۔ لیکن اکیلے رہتے

ہوئے انھیں بڑی وحشت ہو رہی تھی۔ اپنے پہلے ہی خط میں وہ اپنی بیوی شورانی دیوی کو لکھتے ہیں۔

"میں تم سے وداع ہو کر بمبئی خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔ یہاں اسٹوڈیو کا کام بھی دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے تو تم لوگوں کے بغیر اتنی بڑی بمبئی ہوتے ہوئے بھی سونی معلوم ہوتی ہے۔ یہی بار بار خواہش ہوتی ہے کہ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑا ہوں۔ بار بار یہ جھنجھلاہٹ ہوتی ہے کہ کہاں یہ بلا مول لے لی۔ میں نے ابھی مکان نہیں لیا ہے۔ مکان لے لوں گا تو سونا پن مجھے کھانے کے لیے اور دوڑے گا۔"

آہستہ آہستہ پریم چند کا دل لگنے لگا۔ انھوں 'مل مزدور' نام کی ایک فلمی کہانی لکھ کر کمپنی کے مالک بھوٹانی کو پیش کی۔ یہ فلم کیسے بنی اور اس میں کس طرح کی کاٹ چھانٹ کی گئی اس کی روداد اس کمپنی کے ایک اداکار للت کمار کی زبانی سنیے۔

"..... بھوٹانی صاحب کی رائے کے مطابق کہانی میں کئی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ کچھ نئی باتیں جوڑیں اور کچھ ہٹائی گئیں۔ قصہ کو نئی شکل دی گئی۔ اس سے پلاٹ میں صرف تبدیلی ہی نہیں ہوئی بلکہ کئی جگہ اصل مطلب اور زبان کا لطف ہی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد شوٹنگ شروع ہوئی..... اور کئی جگہ پھر تبدیلیاں ہوئیں۔ اس فلم سے کمپنی کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ اس میں ایک ایسے عام مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی تھی جس میں دولت مند یعنی مل کے مالکوں اور مزدوروں کی کشمکش نمایاں تھی..... لیکن افسوس کہ سنسر کی قینچی نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس بے رحمی سے کاٹ چھانٹ کی گئی کہ فلم کی دھجیاں اڑ گئیں۔"

اس فلم میں خود پریم چند نے بھی مزدور یونین کے صدر کا مختصر رول ادا کیا تھا۔ یہ فلم زیادہ کامیاب نہیں ہوسکی۔ حکومت نے بہت سے صوبوں میں اسے دکھانے پر پابندی لگا دی۔

اس کے بعد پریم چند نے "نوجیون" کے نام سے ایک دوسری فلمی کہانی پیش کی۔ جو راجپوتوں کی زندگی کے بارے میں تھی۔ اس پر جو فلم بنی اس کا بھی قریب قریب وہی حشر ہوا جو 'مل مزدور' کا ہوا تھا۔

اسی زمانہ میں ایک دوسری فلم کمپنی 'مہالکشمی سینی ٹون بمبئی' نے پریم چند کے ناول 'بازار حسن' کو فلمایا۔ لیکن اس میں بھی اتنی تبدیلیاں کی گئیں اور اداکاری اتنی کمزور تھی کہ یہ فلم بھی کامیاب نہ ہوسکی۔ پریم چند نے بمبئی کی فلمی زندگی کو جب قریب سے دیکھا تو بہت مایوس ہوئے۔ انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھا کہ فلم بنانے والوں کو صرف پیسہ کمانے کی دھن ہے۔ سماج کی اصلاح اور بہتری ہرگز ان کا مقصد نہیں ہے۔ اس لیے قتل و خون کی وارداتیں مار پیٹ اور ننگا پن فلموں کی جان ہیں۔ اسی سے فلم والے انسان کے مقدّس جذبات اور خود انسانیت کا خون کر رہے ہیں۔ ان حالات سے اکتا کر پریم چند نے جلد ہی وطن جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر انھیں پیسہ کمانے کی ہوس ہوتی تو وہ بمبئی میں رہ کر لاکھوں روپیہ کما سکتے تھے۔ ٹیگور کے بعد وہ بلاشبہ اس وقت ہندوستان کے سب سے بڑے ادیب تھے۔ ان کی شہرت اور نام کی بڑی قیمت تھی۔ لیکن صرف پیسہ کمانا ان کا مدعا نہیں تھا۔ وہ تو یہ خواب لے کر بمبئی گئے تھے کہ فلموں کے وسیلہ سے وہ اپنے خیالات لاکھوں لوگوں تک پہنچا سکیں گے۔ چنانچہ جانے سے پہلے انھوں نے شورانی دیوی سے کہا تھا۔

"وہاں جانے میں جو خاص فائدہ ہوگا وہ یہ کہ ناول اور کہانیاں لکھنے میں

جو نہیں ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ فلم دکھا کر ہو سکے گا۔ کہانیوں اور ناولوں سے تو جو لوگ پڑھتے ہیں وہی فائدہ اٹھا سکیں گے فلم سے ہر جگہ کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں گے۔"

اس لیے مایوس ہو کر انھوں نے وطن جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور کنٹریکٹ ختم ہونے سے تین ماہ قبل ہی وہ بنارس جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء کے ایک خط میں حسام الدین غوری کو لکھتے ہیں۔

"سینما میں کسی اصلاح کی توقع کرنا بیکار ہے۔ یہ صنعت بھی اسی طرح سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جیسے شراب فروشی۔ انھیں اس سے بحث نہیں کہ پبلک کے مذاق پر کیا اثر پڑتا ہے؟ انھیں تو اپنے پیسے سے مطلب .... سینما کے ذریعہ مغرب کی ساری بیہودگیاں ہمارے اندر داخل کی جا رہی ہیں اور ہم بے بس ہیں ... میں نے خوب سوچ لیا اس دائرے سے نکل جانا ہی مناسب ہے۔"

ہندوستانی فلموں کے بارے میں پریم چند کے یہ خیالات آج بھی صحیح ہیں۔ آج بھی فلم سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ایک تجارت ہے۔ اس سے نوجوانوں کا اخلاق برباد ہو رہا ہے۔ پریم چند کو یقین تھا کہ صحت مند فلموں سے تفریح کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح اور بہتری کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ وہ عوام کے مذاق پر یقین رکھتے تھے۔ فلموں کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"عوام کے بارے میں جو خیال ہے کہ وہ مار کاٹ اور سنسنی پیدا کرنے والی تصویروں کو ہی پسند کرتے ہیں محض وہم ہے۔ عوام محبّت، ایثار، رواداری اور انسانی ہمدردی کے جذبات

سے بھری ہوئی فلمیں زیادہ شوق سے دیکھنا چاہتے ہیں مگر ہمارے سینما والوں نے پولس والوں کی ذہنیت سے کام لے کر یہ سمجھ لیا ہے کہ صرف بھدّے مسخرے پن میں، لڑائی اور زور آزمائی میں یا سوفٹ کی اونچی دیوار سے کودنے میں اور جھوٹ موٹ ٹین کی تلوار چلانے میں ہی جنتا کو آنند آتا ہے۔ (یہ انسانی) نفسیات کی بالکل غلط تعبیر ہے۔"

پریم چند تو فلمی دنیا سے بیزار ہو کر چلے آئے لیکن بعد میں ان کے ناولوں اور کہانیوں کی بنیاد پر کئی فلم بنائے گئے۔ ان کے ناول 'بازار حسن' کو ہندی اور گجراتی میں پہلے ہی فلمایا جا چکا تھا۔ اور اسے پسند بھی کیا گیا تھا۔ لیکن ان کا ناول "چوگان ہستی" کی بنیاد پر جو فلم بنایا گیا وہ کامیاب نہیں رہا۔ سرکو پروڈکشن بمبئی نے ان کی کہانی 'تریا چرتر' کی بنیاد پر 'سوامی' نام کا جو فلم بنایا وہ ایک گھریلو فلم کی حیثیت سے کافی پسند کیا گیا۔ ہندی کے مشہور شاعر ڈاکٹر بچّن اس فلم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"سوامی اپنے زمانہ کی خوبصورت فلم تھی۔ پریم چند کی (کہانی) "تریا چرتر" کو کاردار کی منجھی ہوئی ہدایت کاری اور ستارہ اور جے راج کی خوبصورت اداکاری نے ایک خوبصورت اور عوام پسند گھریلو فلم کے روپ میں پیش کر دیا تھا۔"

آزادی کے بعد پریم چند کی کہانی "دو بیل" کی بنیاد پر 'ہیرا موتی' اور 'شطرنج کے مہرے' کی بنیاد پر "شطرنج کے کھلاڑی" دو بے حد کامیاب فلم بنائے گئے۔ اس کے علاوہ ان کے ناول 'گئودان' کو بھی کامیابی سے فلمایا گیا۔

پانچواں باب

پریم چند مارچ ۱۹۳۵ء میں بمبئی سے بنارس واپس گئے۔ بمبئی جانے سے انھیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ مشکل سے ڈیڑھ ہزار روپیے وہاں سے بچا کر لائے۔ بنارس میں ان کا پریس (سرسوتی پریس) نقصان میں چل رہا تھا۔ یہی حال رسالہ 'ہنس' کا تھا۔ دونوں لڑکے الہ آباد میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اب ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ کیا کریں؟

پریم چند اس وقت بلاشبہ ملک کے ممتاز اور ہر دلعزیز ادیب تھے۔ ان کی شہرت ملک کے ہر کونے میں پہنچ چکی تھی۔ ان کی کہانیاں اور ناول نہ صرف اردو اور ہندی میں بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی (ترجمہ کی صورت میں) لوگ بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اس ساری عزّت اور شہرت کے باوجود پریم چند کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ اور صحت کا حال بھی خراب تھا۔ ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ پریس تھا جسے وہ نئے سرے سے چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ (دہلی) کے استاد محمد عاقل صاحب ان سے ملنے بنارس گئے۔ اس ملاقات کا حال وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"پریم چند کا مکان کوئنس کالج کے پیچھے ایک محلّے میں تھا۔ جس مکان میں وہ رہتے تھے وہ دو منزلہ اور پختہ تھا۔ اس کے گرد ایک احاطہ تھا۔ آس پاس کی

فضا اور محلّے میں کچھ قصباتی کیفیت پائی جاتی تھی۔ پریم چند کے احاطہ میں سبزہ، پھول پھلواڑی کچھ بھی نہ تھا۔ مکان میں کچھ ٹھاٹھ یا شان نظر نہ آتی تھی۔ پریم چند مکان کے بالائی حصّے میں رہتے تھے۔ نیچے کے حصّے میں پریس کا کام ہوتا تھا ....

جس کمرے میں میری ان سے ملاقات ہوئی وہ خاصا بڑا کھلا ہوا صاف اور ہوادار تھا۔ زمین پر صاف چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ایک نواڑی پلنگ تھا جس کے قریب ایک پیک دان رکھا ہوا تھا۔ پریم چند فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک کاپی پر ہندی میں اپنے کسی ناول کے مسودے کو .... لکھ رہے تھے۔

بات چیت خاص طور پر ہندو مسلمان تعلقات کے بارے میں تھی۔ اسی زمانہ میں میں نے ایک مضمون بہ عنوان "ہندو مسلمان کدھر جا رہے ہیں؟" 'ہنس' میں لکھا تھا۔ پہلے اُس پر گفتگو ہوتی رہی ..... پریم چند موجودہ حالت پر افسوس کر رہے تھے۔ اور اُس کا ذمّہ دار مذہب کی غلط تعبیر کو ٹھہرا رہے تھے۔ پریم چند نے مجھ سے کہا۔ 'مجھے رسمی مذہب پر کوئی اعتقاد نہیں ہے۔ پوجا پاٹھ اور مندروں میں جانے کا بھی مجھے شوق نہیں ہے۔ شروع سے میری طبیعت کا یہی رنگ ہے .... انھوں نے کہا میری سنسکرتی اور طرزِ معاشرت بھی ملی جلی ہے۔ بلکہ مجھ پر مسلمانوں کی تہذیب کا ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ اثر پڑا ہے۔ میں نے مکتب میں میاں جی سے فارسی اور اردو پڑھی۔ ہندی سے بہت پہلے میں نے اردو میں

لکھنا شروع کیا۔ ہندی زبان میں نے بہت بعد میں سیکھی۔"

پریم چند اس زمانہ میں ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے اور اردو ہندی کے جھگڑے کو حل کرنے کے لیے بہت فکر مند رہتے تھے۔ ان کا ایک ناول "میدان عمل" بھی اسی زمانہ میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا تھا۔ جو ہندی میں پہلے ہی چھپ چکا تھا۔ اس ناول میں انھوں نے دکھایا ہے کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے لاکھوں غریب انسانوں کو ظلم اور لوٹ کھسوٹ کے شکنجہ میں جکڑے ہوئے ہے۔ عوام اب اس ظلم کو خاموشی سے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اس کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ کسان لگان دینا بند کر دیتے ہیں۔ ستیہ گرہ اور ہڑتال کرتے ہیں۔ سارا ملک غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی آگے ہیں۔ دونوں ہی قربانیاں دے رہے ہیں، اگر ایک طرف امرکانت اور منی ہیں تو دوسری طرف سلیم اور سکینہ ہیں، الغرض یہ ناول پورے ملک کی بیداری کی تصویر بن جاتا ہے۔

۱۹۳۴ء میں پریم چند کے افسانوں کا ایک مجموعہ "آخری تحفہ" لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی 'قاتل'، آخری تحفہ اور 'جیل'، ایسی کہانیاں ہیں جن میں آزادی کے اندولن کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

بمبئی سے واپس آکر پریم چند 'سرسوتی پریس' اور 'ہنس' کے دفتر کو بنارس سے الہ آباد لے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اس زمانہ میں ہندی ساہتیہ سمیلن' کے ادبی بورڈ نے مہاتما گاندھی کے مشورہ سے سارے ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں کی انجمن بنانے اور اس طرح ہندوستانی ادب کی اشاعت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لیے ایک ایسے رسالہ کی ضرورت تھی جو مختلف زبانوں کے

ادب کا ترجمہ کر کے پیش کر سکے۔ پریم چند نے یہ ذمّہ داری ہنس کو سونپ دی۔ حسام الدین غوری کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"'ہنس'، ہندی رسم الخط کے ذریعہ ہندوستان کی سبھی زبانوں کی ادبیات سے بہترین مواد فراہم کر کے پبلک کو دے گا اور اس طرح قومی ادب کی بنیاد ڈالے گا۔ جس میں ہر ایک زبان کے مصنّف اور ادیب موجود ہوں گے۔ اردو کے لیے بھی ایک حصّہ وقف ہے۔"

پریم چند یہ سارے کام کر رہے تھے لیکن ان کی مالی حالت خراب اور خستہ ہوتی جا رہی تھی۔ ستمبر ۱۹۳۵ء کے ایک خط میں اپنے دوست جینندر کمار کو لکھتے ہیں۔

"روپیے کے متعلق کیا لکھوں؟ تم نے کچھ ٹیڑھا سیدھا کام کیا بھی۔ میں پانچ مہینے میں ایک پیسہ بھی نہیں کما سکا۔ بمبئی سے جو تھوڑے سے پیسے لایا تھا وہ پانچ مہینے میں کھا گیا اور کچھ قرض چکا دیا۔ اور ایسا تھا ہی کیا۔ اب اسی فکر میں گھل رہا ہوں کہ آگے کیا ہوگا؟ 'میدان عمل'، (ہندی) اور 'غبن'، دونوں قریب قریب ختم ہیں۔ مجھے کوڑی نہ ملی۔ انھیں دوبارہ چھپوانے کی فکر البتہ ہو رہی ہے۔"

پریم چند کی شہرت اب اتنی پھیل گئی تھی کہ ملک کی بہت سی ادبی انجمنیں اور ادارے ان کو بلاتے تھے۔ دور دراز جگہوں پر وہ نہیں جا پاتے تھے۔ لیکن جن اداروں کو وہ اہم سمجھتے تھے وہاں ضرور جاتے تھے۔ فروری ۱۹۳۶ء میں 'ہندوستانی اکیڈمی' کا ایک جلسہ الہ آباد میں ہوا۔ اس میں وہ شریک ہوئے۔ اسی جلسہ میں اردو کے مشہور افسانہ نگار احمد علی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی۔ ان کے

علاوہ فراق گورکھپوری، دیا نرائن نگم اور دوسرے ممتاز ادیب بھی اکیڈمی کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ احمد علی پریم چند سے اپنی ملاقات کی تفصیل اس طرح لکھتے ہیں۔

"اس وقت اچانک برآمدے کے موڑ سے ایک دبلے پتلے صاحب آتے دکھائی دیے۔ جن کا قد کچھ زیادہ لمبا تو نہیں تھا لیکن وہ اپنے دُبلے پن کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی لمبے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے چہرہ سے مسرّت نمایاں تھی اور آنکھوں میں محبّت بھری تھی۔ اور ان سے نرمی اور اعتقاد کا ملا جلا ایک ایسا جذبہ جھلکتا تھا جو زندگی کے مسائل پر سنجیدہ غور و فکر اور اس کے مصائب کی برداشت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ وہ شیروانی اور چست پاجامہ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ گاندھی ٹوپی میں سے دونوں طرف نکلے پیچھے گردن کے بال دکھائی دیتے تھے۔ ان کی گھنی مونچھوں میں کالے بالوں کی نسبت سفید زیادہ تھے۔ ان کے طور اطوار نہایت شریفانہ تھے۔ میرے دوست رگھوپتی سہائے (فراق) نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ مجھے معلوم ہوا کہ منشی پریم چند ہیں۔ وہ خوب گھُل مل کر اور مزے لے لے کر باتیں کرتے تھے۔"

الہ آباد میں پریم چند کی ملاقات نوجوان ادیب سجّاد ظہیر سے بھی ہوئی جو اسی زمانہ میں لندن سے واپس آئے تھے۔ یہیں ایک میٹنگ میں پریم چند کے مشورہ سے نوجوان ادیبوں نے ہندوستان میں "انجمن ترقی پسند مصنّفین" قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ چند ماہ کے بعد پریم چند ہندی ساہتیہ سمیلن کے صوبائی جلسہ میں شریک ہونے پورنیا (بہار) چلے گئے۔ واپس آکر ہندی کے ایک ادیب بنارسی داس چترویدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اردو کے اخبار بازی لے جا رہے ہیں۔ پچاس سے بھی زیادہ ماہوار رسالے نکلتے ہیں۔ اِوران میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو دو روپیے کا یا ڈھائی روپیے کا پانچ سو صفحات کا سالنامہ نہ نکالتا ہو۔ یقیناً ان کا ادبی مذاق بہتر ہے ..... ہندی ادب ابھی تک انفرادی اور جذباتی ہے ... نہ اس میں کوئی تڑپ ہے نہ یہ حیات بخش ہے۔ یہ مایوسی کے سوا کچھ نہیں دے سکتے۔ اردو کے شاعر صحت مند ذہن والے سچّائی پسند اور رجائی (امید پسند) ہیں۔ ان کے آدھے درجن شاعر مسلمان قوم کو بھائی چارے اور جمہوریت کے لیے نئے اصول کے سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ مسلمان شاعر کمیونسٹ ہیں۔"

اس وقت دہلی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر پطرس بخاری تھے۔ جو پریم چند کے بڑے قدرداں تھے۔ انھوں نے پریم چند کو ریڈیو پر کہانی پڑھنے کے لیے بلایا۔ پریم چند نے وعدہ کر لیا اور آ بھی گئے۔ لیکن اپنے دوست جیندر کمار کے پاس ٹھہرے۔ ریڈیو والوں کو اطلاع بھی نہیں دی وہ پریشان تھے۔ آخر کار پریم چند پروگرام نشر ہونے سے دس منٹ پہلے پیدل ریڈیو اسٹیشن پہنچے۔ ان کے ساتھ جیندر کمار بھی تھے۔ وہ ایک کشادہ کمرے میں بٹھائے گئے۔ اتنے میں ایک لمبے سے خوبصورت نوجوان تیزی سے بڑھتے ہوئے پریم چند کے پاس آئے اور بڑی گرمجوشی سے ان سے بغل گیر ہوئے۔ پریم چند حیران تھے۔ واپسی پر انھوں نے جیندر کمار سے پوچھا۔

"کیوں جی۔ وہ بخاری تھے کیا؟

"میں کیا جانوں"

تو پھر کون تھے ؟

آپ تو اس قدر گرمجوشی کے ساتھ ہم آغوش ہوئے اور اب پوچھتے ہیں۔

" میں نے سمجھا بخاری ہوں گے لیکن " رک گئے۔

" لیکن کیا ؟ "

" کوئی عجیب حضرت تھے۔ دیکھو نہ ایسے بڑھے چلے آئے جیسے کہ میں ان کا لنگوٹیا یار ہوں "

یہ مارچ ۱۹۳۶ء کا زمانہ تھا۔ دہلی میں ہولی کا تہوار منایا جا رہا تھا۔ پریم چند کو ہندو مسلم اتحاد کی بڑی فکر تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اردو اور ہندی کے ادیب مل کر بیٹھیں اور اس مقصد کے لیے کام کرنے کا پروگرام بنائیں۔ جامعہ ملّیہ کے استاد محمد عاقل صاحب نے جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں ایک جلسہ بلایا۔ ہندی کے کچھ ادیب بھی اس میں شریک ہوئے۔ اس جلسہ کی کامیابی سے پریم چند بہت مطمئن اور خوش تھے۔ آخر میں " ہندوستانی مہاسبھا " نام کی ایک انجمن قائم کی گئی۔ پریم چند نے اس کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور اس پر زور دیا کہ اردو اور ہندی کے ادیب ایک دوسرے سے ملیں اور اپنے مسائل پر تبادلۂ خیالات کریں۔

واپسی پر پریم چند نے اس جلسہ کے بارے میں اپنے دوست بنارسی داس چترویدی کو ایک خط میں لکھا۔

" دہلی کی " ہندوستانی سبھا " میری اور جینندر کمار کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جب تک ہم دوسری زبان کے ادیبوں سے میل جول نہ پیدا کریں، ان سے دوستی نہ بڑھائیں، ادبی مسائل پر ان سے روشنی ڈالنے کو نہ کہیں۔ تبادلہ خیالات نہ کر سکیں

ہم (اپنے) خیالات میں وہ فراخ دلی اور دلوں میں وہ فیاضی کیسے پیدا کر سکتے ہیں ..... ہندوستانی سبھا کے جلسے پندرہ روزہ ہوا کریں گے۔ جس میں ادب اور زبان کے متعلق تقریریں ہوں گی ..... اگر ہم تمام مرکزوں میں اس طرح کی سبھاؤں کا انتظام کر سکیں تو ہم موجودہ تنگ نظری کو دور کر سکیں گے۔"

۲۶ اپریل ۱۹۳۶ء کو بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا ایک اجلاس ناگپور میں ہوا۔ پریم چند کی صحت تسلی بخش نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اس میں شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، کاکا کالیلکر، مولوی عبدالحق اور ہندوستانی زبانوں کے دوسرے ادیب بھی شریک ہوئے۔ اسی اجلاس میں ہندوستان کی رابطہ کی قومی زبان بنانے کے لیے 'ہندی ہندوستانی' کی تجویز منظور ہوئی۔ اب تک مہاتما گاندھی، پریم چند اور دوسرے ادیب یہ کہتے آئے تھے کہ آزاد ہندوستان میں ہندی، انگریزی یا اردو کے بجائے 'ہندوستانی' قومی زبان کا رتبہ حاصل کرے گی اور وہ ہندی اور اردو دونوں لپیوں میں لکھی جائے گی۔ لیکن بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اس اجلاس میں زیادہ لوگوں نے 'ہندی ہندوستانی' کے حق میں ووٹ دیا لیکن پریم چند نے اپنا ووٹ "ہندوستانی" کی حمایت میں ہی دیا۔ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مولوی عبدالحق نے ناگپور سے واپسی پر رسالہ 'اردو' میں ایک اداریہ لکھا۔ اس میں پریم چند کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بددل ہی نہیں تھے بلکہ برہم بھی ہوئے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندی اردو کے جھگڑے مٹا کر کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جو دونوں فرقوں

میں مقبول ہو سکے لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی اس سے وہ بھی ایسے ہی مایوس ہوئے جیسے ہم میں سے بعض لوگ۔"

جیسا کہ ذکر آچکا ہے پریم چند ہر اُس جھگڑے کا حل نکالنا چاہتے تھے جو ہندو مسلم اتّحاد کے راستہ میں رکاوٹ تھا۔ گاندھی جی بھی یہی چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کے عام لوگ جو زبان بولتے ہیں وہ نہ مشکل ہندی ہے اور نہ مشکل اردو۔ وہ عام بول چال کی آسان اور سلیس زبان ہے۔ جسے وہ 'ہندوستانی' کا نام دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہی آزاد ہندوستان میں رابطہ کی قومی زبان کا درجہ حاصل کرے۔ لیکن پریم چند کی موت کے بعد ملک کے سیاسی حالات نے جو رخ اختیار کیا اس کی وجہ سے ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا۔

پریم چند ابھی بہت بوڑھے تو نہیں تھے لیکن لگاتار محنت، فکروں اور بیماریوں نے ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ جسمانی قوّت ان کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی لیکن اپنے خیالات کے اعتبار سے وہ اب بھی جوان تھے ان کے حوصلے اب بھی بلند تھے۔ وہ اپنے وطن کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے ان کے دل میں ہندوستان کے دبے کچلے محنت کش انسانوں کا جو درد تھا۔ اس کی وجہ سے اب وہ یہ بھی سوچنے لگے تھے کہ یہ آزادی، جو ملے گی، کیسی ہوگی اور اس کا فائدہ سماج کے کن طبقوں کے لوگوں کو پہنچے گا؟ ۱۹۳۴ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگرس سوشلسٹ پارٹی بنائی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں جمہوری طریقوں سے سوشلسٹ نظام قائم کیا جائے۔ یعنی ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں ظلم کرنے والے طبقے زمیندار، سرمایہ دار اور ساہوکار نہ ہوں۔ ملک کی دولت میں سب کا حصّہ ہو۔ سب کو ترقی کرنے کے یکساں موقعے ملیں۔ پریم چند ذات پات اور چھوت چھات کے بھی سخت

مخالف تھے۔ اور کہتے تھے کہ جب تک ہمارے ملک میں ذات پات کا فرق باقی رہے گا ہماری آزادی مکمّل نہیں ہوگی۔ اس لیے اس زمانہ میں وہ سوشلسٹ خیالات سے بھی بہت متاثر ہوئے۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے ملک کے نوجوان ادیب، ادیبوں کی ایک انجمن بنانا چاہتے تھے ــــ پریم چند نے شروع سے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے والے بعض نوجوان ادیب سجّاد ظہیر، ملک راج آنند اور ڈاکٹر تاثیر لندن میں ہندوستانی ادیبوں کی اس انجمن کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ سجّاد ظہیر ہندوستان آئے۔ یہاں انھوں نے رشید جہاں، احمد علی، فیض احمد فیض اور دوسرے نوجوان ادیبوں کی مدد سے 'انجمن ترقی پسند مصنّفین' کی پہلی کانفرنس کرنے کی تیاریاں شروع کیں۔ اس کانفرنس کی صدارت کے لیے پریم چند سے درخواست کی۔ کانفرنس لکھنؤ میں اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں پریم چند نے جو خطبۂ صدارت پڑھا وہ پچھلے پچاس سال سے ہندوستانی ادیبوں کو روشنی دے رہا ہے۔ اس میں انھوں نے ادیب کی قومی ذمّہ داریوں پر زور دیا تھا اور لکھا تھا ــــ

"جب تک ادیب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا، محض لوریاں گا کر سلانا تھا ... اُس وقت تک ادیب کے لیے عمل کی ضرورت نہ تھی ..... مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکّر ہو۔ آزادی کا جذبہ ہو۔ حسن کا جوہر ہو۔ تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔ جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ پیدا کرے۔ سُلائے نہیں۔ کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"

اتنا بڑا ادیب ہونے کے باوجود پریم چند کو کسی طرح کا غرور نہیں تھا۔ اس کانفرنس میں بہ حیثیتِ صدر جب وہ شریک ہونے کے لیے لکھنؤ گئے تو اسٹیشن پر کوئی ان کا استقبال کرنے بھی نہیں جا سکا۔

اکے پر وہ خود آ گئے۔ ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس میں پریم چند کی شرکت کا حال ڈاکٹر رشید جہاں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے

"لکھنؤ میں سجّاد ظہیر کے گھر میں پندرہ کے قریب مہمان ٹھہرے ہوئے تھے ..... لیکن منشی پریم چند کے آنے کی کوئی اطلاع ہمیں نہیں ملی۔ ہم سب پریشان تھے کہ کیا ہوگا۔ کہیں منشی جی بیمار تو نہیں ہوگئے۔ ہم سب دوپہر کا کھانا کھا کر اس پر بحث کر رہے تھے کہ آیا تار ابھی بھیجیں یا کچھ دیر اور انتظام کر کے .... سجّاد ظہیر کسی کام سے باہر نکلے۔ اور واپس جو آئے تو ایک میانہ قد کا کھدر پوش ان کے ساتھ تھا... پھر ایک دم ان کو پہچان کر ہم سب خوش ہوگئے۔

ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی مجھے فوراً میرے کمرے سے نکالا گیا اور صدر کو وہ کمرہ ملا۔ جب میرا اسباب ہٹایا جا رہا تھا تو منشی جی کو بے حد بُرا لگ رہا تھا کہ مجھے اتنی تکلیف ان کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ اور اس بات کا یقین دلانے پر کہ دوسرا کمرہ اتنا ہی اچھا ہے وہ راضی ہوئے اور مجھے وہاں سے اپنی چیزیں ہٹانے دیں۔

منشی پریم چند جن کے نام سے ہندوستان کا کونہ کونہ واقف تھا اور لوگ منّتیں خوشامدیں کر کے بلاتے تھے بغیر کسی شکایت اور غصّہ کے آتے ہی ایسے خوش ہوگئے کہ جیسے کوئی بات ہی غیر معمولی نہیں ہوئی۔ ہم لوگوں کو بڑی شرمندگی ہوئی کہ پریم چند جی آئیں اور انھیں کوئی اسٹیشن پر نہ ملے۔

اپنی بزرگی اور علمیت کا کوئی غرور ان میں نہیں تھا۔ ہم سے برابر والوں کی سی

باتیں کرتے رہے۔ ان کے دماغ اور خیالوں میں تجربے کے ساتھ جوانوں کا سا جوش اور تر و تازگی تھی۔ اور کون کہہ سکتا تھا کہ یہ عمر رسیدہ شخص ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ہم کھل کر ان سے باتیں کر سکتے تھے۔ کھانے کے بعد دھوتی کرتے میں آرام سے صوفے میں بیٹھ کر اپنا گھٹنا ہلانے لگے۔ جب وہ کوئی بات دلچسپی سے کر رہے ہوں اور بحث میں بالکل ڈوبے ہوں تو میں دیکھتی تھی کہ گھٹنے پر گھٹنا رکھ کر ہلانے لگتے تھے۔ اگر بحث جوش کی ہو تو گھٹنا جلدی جلدی ہلتا تھا اور جو معمولی باتیں ہوں تو آہستہ آہستہ۔

منشی جی بہت جلد مانوس ہو جاتے تھے اور جلد ہی ہمیں ایسا لگنے لگا کہ کوئی غیر شخص ہمارے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ ساری عمر کا دوست ہمارے سامنے بیٹھا ہے۔ یہ گھل مل جانے کی اتنی لاجواب خاصیت پریم چند میں تھی کہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ کر دیتی تھی۔"

اس زمانہ میں ان کا مشہور افسانہ 'کفن' اردو میں شائع ہوا۔ ہر طرف سے اس کی تعریف ہوئی۔ اس میں انھوں نے گاؤں کے دو نہایت غریب اور پسماندہ انسانوں گھیسو اور مادھو کی کہانی بیان کی ہے۔ غریبی بھوک اور ہر وقت کی ذلّت برداشت کرنے سے وہ بالکل حیوانوں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی بے حسی اور بے پروائی سے مادھو کی بیوی رات میں چلّاتے چلّاتے مر جاتی ہے۔ دوسرے دن گاؤں کے لوگ انھیں پیسے دیتے ہیں کہ وہ شہر جا کر اس کے لیے کفن خرید لائیں۔ لیکن انھوں نے مہینوں سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ پریم چند لکھتے ہیں۔

"بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔ 'لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے کیوں مادھو'

مادھو بولا۔ 'ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کپھن چاہیے'

'تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں'

'ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کپھن کون دیکھتا ہے'

'کیا بُرا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے۔ اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے'

'اور کیا رکھا رہتا ہے؟ یہی پانچ روپیے پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے'

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا، معنوی طور پر سمجھ رہے تھے بازار میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتّفاق سے یا عمداً ایک شراب خانہ کے سامنے آ پہنچے۔ اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی۔ کچھ گزک لی اور دونوں برامدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔

گھیسو بولا۔ 'کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا'

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔

"دنیا کا دستور یہی ہے۔ یہیں لوگ باہمنوں کو ہزاروں روپے کیوں دیتے ہیں؟ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں'

'بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے۔ پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے؟

'لیکن لوگوں کو جواب کیا دوگے؟ لوگ پوچھیں گے کپھن کہاں ہے؟'

گھیسو ہنسا۔ "کہہ دیں گے روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا۔ ملے نہیں'

مادھو بھی ہنسا۔ "اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔
'بڑی اچھی تھی بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر"

اس طرح پریم چند نے اپنی اس کہانی میں، گاؤں کے نچلے غریب طبقہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ لیکن ہندوستانی گاؤں کی اس سے زیادہ بڑی اور شاندار تصویر پریم چند نے اپنے شاہکار ناول 'گئودان' میں کھینچی ہے جو اسی زمانہ میں ہندی میں شائع ہوا تھا۔ (اردو میں یہ ناول ان کی موت کے بعد شائع ہوا) یہ گاؤں کے ایک معمولی کسان ہوری اور اس کے کنبہ کی کہانی ہے۔ پریم چند نے دکھایا ہے کہ کس طرح زمیندار، پولس کے لوگ، ساہوکار اور برہمن اسے لوٹتے ہیں۔ اس کی محنت کی کمائی پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ وہ مزدوری کرتا ہے۔ فاقے کرتا ہے۔ آخر میں اپنی تین بیگھے زمین کو بچانے کے لیے اپنی بیٹی روپا کو ایک بوڑھے کے ہاتھ دو سو روپے میں فروخت کر دیتا ہے۔ زندگی میں اس کی کوئی آرزو پوری نہیں ہوتی۔ آخر ایک تپتی دوپہر کو لو کے آتشیں جھونکے اس کے کمزور جسم کو پھونک ڈالتے ہیں۔ صرف موت ہی اسے زندگی بھر کے دکھوں، محرومیوں اور ذلتوں سے چھٹکارا دلاتی ہے۔

پریم چند کا یہ ناول آج بھی اردو اور ہندی کے بہترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ اس میں آزادی سے پہلے کے ہندوستان کی اور ہندوستانی گاؤں کی حقیقی زندگی نظر آتی ہے۔

پریم چند کی صحت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ علاج جاری تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ اگست ۱۹۳۶ء کے خط میں اپنے دوست دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔

"کوئی ڈیڑھ دو مہینے سے مجھے ورم جگر کی شکایت ہو گئی ہے۔ دو بار منھ سے سیروں خون نکل گیا ہے۔ بنارس میں علاج سے کوئی فائدہ نہ دیکھ کر ۳ر اگست

کو یہاں (لکھنؤ) آگیا اور ڈاکٹر ہرگوبند سہائے کے زیرِ علاج ہوں۔ .... گھُل کر آدھا رہ گیا ہوں۔ زرد۔ نہ کچھ کھاسکتا ہوں۔ نہ ہضم ہوتا ہے..... دیکھیے اس بیماری سے نجات ملتی ہے یا یہ آخری پیغام ہے۔"

پریم چند لکھنؤ میں اپنے ایک مسلمان دوست کے ساتھ ٹھہرے جو حکیم تھے۔ کئی ہفتوں کے علاج کے باوجود فائدے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ ان کا بڑا لڑکا ان کے ساتھ تھا۔ بگڑتی حالت کو دیکھ کر انھوں نے اپنی بیوی کو بلوانے کے لیے لکھا لیکن پھر گھبرا کر اچانک خود ہی بنارس چلے گئے۔ بیوی ان کو دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔ پوچھا۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

پریم چند بولے۔ "اب میں نہیں بچنے کا۔ جلندھر ہے۔ کھانا بھی چھڑا دیا ہے۔ تین روز سے کچھ نہیں کھایا۔

G 700

شورانی۔ "کچھ کھایا بھی تین دنوں سے۔"

پریم چند۔ "نہیں۔"

شورانی۔ "تبھی آپ کمزور ہوگئے ہیں۔ آخر ڈاکٹر نے کھانے کے لیے کچھ تو بتایا کہ کچھ نہیں۔

پریم چند۔ "بارلی اور بوتل کا دودھ بتایا ہے۔"

شورانی دیوی نے لکھا ہے کہ انھوں نے پریم چند کو دودھ پلانے کی کوشش کی اور کہا۔

"میں خود کل لکھنؤ آنے والی تھی۔"

پریم چند۔ "کئی روز رات بھر دست آتے رہے۔ شاید ڈاکٹر نے جلاّب دے دیا تھا۔

میں نے ہی دھنو (بیٹے) سے لکھوایا تھا کہ چلی آؤ۔ کیونکہ جب مجھے دست آتے تھے تو کموڈ حکیم جی کو خود صاف کرنا پڑتا۔ حکیم دیوتا ہیں۔ اس کی شرافت کیا بتلاؤں۔ انھوں نے میری سیوا جی جان سے کی۔ دس دن وہاں تھا۔ تب تک حکیم جی سوئے نہیں۔ دھنو کو سلا کر رات بھر میرے پاس بیٹھے رہتے۔ ایسا شریف آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ ایسے مسلمان پر ہزاروں ہندو قربان ہو سکتے ہیں۔ میں اچھا ہو گیا تو اس کی سیوا کروں گا۔"

پریم چند کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی۔ نا امیدی بڑھتی گئی۔ ان کے پیٹ میں شدید درد ہوتا تھا نیند بالکل نہیں آتی تھی، اکثر آنکھیں کھولے پڑے رہتے تھے۔ آخر ۸ر اکتو ۱۹۳۶ء کی صبح کو انھوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ جس نے ہمیشہ زندہ رہنے والی کہانیاں لکھیں اس طرح اس کی زندگی کی کہانی کا خاتمہ ہو گیا۔

بڑے بھائی صاحب

میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے۔ لیکن صرف تین درجے آگے۔ انھوں نے بھی اسی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا لیکن تعلیم جیسے اہم معاملے میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے۔ اس عمارت کی بنیاد خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے۔ ایک سال کا کام دو سال میں کرتے تھے۔ تاکہ عمارت پختہ ہو جائے۔

میں چھوٹا تھا، وہ بڑے تھے۔ میری عمر نو سال تھی، وہ چودہ سال کے تھے۔ انھیں میری تنبیہ اور نگرانی کا پورا اور پیدائشی حق تھا اور میری سعادت مندی اسی میں تھی کہ ان کے حکم کو قانون سمجھوں۔ وہ بڑے محنتی واقع ہوئے تھے۔ ہر وقت کتاب کھولے بیٹھے رہتے اور شاید دماغ کو آرام دینے کے لیے کبھی کاپی پر، کبھی کتاب کے حاشیوں پر چڑیوں، کتّوں، بلّیوں کی تصویریں بنایا کرتے، کبھی کبھی ایک ہی نام کو دس بیس بار خوش خط حروف میں نقل کرتے، کبھی ایسی عبارتیں لکھتے جن میں کوئی ربط نہ ہوتا، نہ کوئی معنی۔ مثلاً ایک بار ان کی کاپی میں مَیں نے یہ عبارت دیکھی — اسپیشل، آئینہ، بھائیو، بھائیوں، دراصل، بھائی بھائی، رادھے شیام، سری پت رادھے شیام، ایک گھنٹے تک، اس کے بعد ایک انسان کا چہرہ تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس عبارت میں کوئی معنی نکالوں، لیکن ناکام رہا۔ اور ان سے پوچھنے کی ہمّت نہ پڑی۔ وہ نویں جماعت میں تھے۔ میں پانچویں جماعت میں۔ اُن کی تحریر سمجھنا میرے لیے چھوٹا منھ بڑی بات تھی۔

میرا جی پڑھنے میں بالکل نہ لگتا۔ ایک گھنٹہ بھی کتاب لے کر بیٹھنا بارِ خاطر تھا۔ موقع پاتے ہی ہاسٹل سے نکل کر میدان میں آجاتا اور کبھی کنکریاں اچھالتا، کبھی کاغذ کی تتلیاں اڑاتا، اور کہیں کوئی ساتھی مل گیا تو پوچھنا ہی کیا، کبھی چار دیواری پر چڑھ کر پیچھے کود رہے ہیں، کبھی پھاٹک پر سوار ہو کر موٹر کا لطف اٹھا رہے ہیں لیکن کمرے میں آتے ہی بھائی صاحب کی صورت دیکھ کر روح فنا ہو جاتی اور سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ پہلا سوال ہوتا، کہاں تھے؟ اس کا جواب خاموشی کے سوا میرے پاس اور کچھ نہ ہوتا۔ نہ جانے میری زبان سے یہ بات کیوں نہ نکلتی کہ ذرا باہر کھیل رہا تھا۔ میری خاموشی اعترافِ گناہ سمجھی جاتی اور بھائی صاحب پدرانہ محبّت اور تندی سے ملے ہوئے لہجے میں کہتے۔ اس طرح اگر انگریزی پڑھو گے تو زندگی بھر پڑھتے ہی رہو گے اور ایک حرف نہ آئے گا۔ انگریزی پڑھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے جو چاہے پڑھ لے۔ اس طرح انگریزی آتی تو سبھی پڑھ لیتے۔ یہاں رات دن آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں، خون جلانا پڑتا ہے، تب جاکر کہیں انگریزی آتی ہے اور میں کہتا ہوں تم کتنے کوڑھ مغز ہو کہ مجھے دیکھ کر بھی سبق نہیں لیتے۔ میں کتنی محنت کرتا ہوں۔ یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ اگر نہیں دیکھتے تو یہ تمھارا قصور ہے، تمھاری عقل کا قصور ہے۔ اتنے میلے تماشے ہوتے ہیں میں کبھی نہیں جاتا۔ روز کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوتے ہیں، میں قریب نہیں پھٹکتا، ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں۔ اس پر بھی دو دو، تین تین سال ایک ایک درجے میں پڑا رہتا ہوں۔ پھر تم کیسے امید کرتے ہو کہ تم یوں کھیل کود میں وقت گنوا کر پاس ہو جاؤ گے۔ مجھے دو ہی تین سال لگتے ہیں۔ تم ساری زندگی اسی درجے میں پڑے سڑتے رہو گے۔ اگر تمھیں اسی طرح عمر گنوانی ہے تو بہتر ہے گھر چلے جاؤ اور مزے سے گلی ڈنڈا کھیلو۔ دادا کی گاڑھی کمائی کے روپے کیوں برباد کرتے ہو۔

میں یہ پھٹکار سن کر آنسو بہانے لگتا۔ جواب ہی کیا تھا! بھائی صاحب کو نصیحت کے فن میں کمال

تھا۔ ایسی ایسی لگتی باتیں کہتے تھے کہ میرے جگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور ہمت ٹوٹ جاتی۔ اس طرح جان توڑ کر محنت کرنے کی طاقت میں اپنے میں نہ پاتا تھا اور ذرا دیر کے لیے مجھ پر مایوسی غالب آجاتی اور میں سوچتا کیوں نہ گھر چلا جاؤں؟ جو کام میرے بوتے کے باہر ہے اس میں ہاتھ ڈال کر کیوں اپنی زندگی خراب کروں۔ اس کے ساتھ ہی آئندہ سے خوب جی لگا کر پڑھنے کا ارادہ کرتا، ٹائم ٹیبل بناتا، صبح اٹھتا، منہ دھو کر ناشتہ کرتا۔ پھر انگریزی کا مطالعہ سات سے آٹھ تک، حساب آٹھ سے نو تک، تاریخ نو سے ساڑھے نو تک، کھانا کھا کر اسکول جانا، ساڑھے تین بجے اسکول سے واپس، آدھ گھنٹہ تک آرام، پانچ تک جغرافیہ اور نقشہ، پانچ سے چھ تک گرامر، آدھ گھنٹہ آرام، چھ سے ساڑھے سات تک انگریزی کمپوزیشن، پھر کھانا کھا کر آٹھ سے نو تک انگریزی، نو سے دس تک اردو، دس سے گیارہ تک متفرق مضامین۔ مگر ٹائم ٹیبل بنا لینا ایک بات تھی اس پر عمل کرنا دوسری بات۔ پہلے ہی دن سے اس کی خلاف ورزی شروع ہو جاتی۔ میدان کی وہ فرحت انگیز ہوا، وہ دلآویز ہریالی، وہ پُرلطف آزادی مجھے اضطراری طور پر کھینچ لے جاتی اور بھائی صاحب کو نصیحت اور فضیحت کرنے کا موقع مل جاتا۔ میں ان کے سائے سے بھاگتا، ان کی نگاہوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا۔ کمرے میں اس طرح دبے پاؤں آتا کہ انھیں خبر نہ ہو۔ ان کی نگاہ میری جانب اٹھی اور میری روح فنا ہوئی۔ ہمیشہ سر پر ایک برہنہ شمشیر سی لٹکتی معلوم ہوتی۔ کتابوں سے نفرت سی ہو جاتی تھی

(۲)

سالانہ امتحان ہوا۔ بھائی صاحب فیل ہو گئے۔ میں پاس ہو گیا اور درجے میں اوّل آیا۔ میرے اور ان کے درمیان صرف دو درجوں کا تفاوت رہ گیا۔ جی میں آیا بھائی صاحب کو آڑے ہاتھوں لوں۔ آپ کی وہ شبانہ روز کی دیدہ ریزی کہاں گئی۔ مجھے دیکھیے مزے سے کھیلتا بھی رہا اور درجے میں اوّل

ہوں لیکن اس قدر پژمردہ اور شکستہ خاطر تھے کہ مجھے ان سے دلی ہمدردی ہوئی۔ اور ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کا خیال ہی شرمناک معلوم ہوا۔ ہاں اب مجھے اپنے اوپر کچھ اعتماد پیدا ہوا اور بھائی صاحب کا وہ رعب مجھ پر نہ رہا۔ آزادی سے کھیل کود میں شریک ہونے لگا۔ دل مضبوط تھا۔ اگر انھوں نے پھر فضیحت کی تو صاف کہہ دوں گا آپ نے اپنا خون جلا کر کون سا تیر مار لیا۔ میں تو کھیلتے کودتے درجے میں اوّل آگیا۔ زبان سے یہ ہیکڑی جتانے کی ہمّت نہ ہونے پر بھی میرے بشرے اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں بھائی صاحب سے اب اتنا مرعوب نہیں ہوں۔ بھائی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور ایک روز جب میں صبح کا سارا وقت گلی ڈنڈے کی نذر کر کے ٹھیک کھانے کے وقت لوٹا تو بھائی صاحب نے گویا میان سے تلوار کھینچ لی اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ دیکھتا ہوں امسال پاس ہو گئے اور درجے میں اوّل آگئے تو اب تمھیں دماغ ہو گیا ہے۔ مگر بھائی جان گھمنڈ تو بڑے بڑوں کا نہیں رہا تمھاری کیا ہستی ہے! تاریخ میں راون کا حال تو پڑھا ہی ہو گا۔ اس کی زندگی سے آخر تم نے کیا نتیجہ نکالا؟ یا یوں ہی پڑھ گئے محض امتحان پاس کر لینا تو کوئی بڑی چیز نہیں۔ اصل چیز ہے تاریخ سے سبق حاصل کرنا۔ راون ساری دنیا کا راجہ تھا۔ ایسے راجوں کو چکرورتی کہتے ہیں۔ آج کل انگریزوں کا راج بہت وسیع ہے مگر انھیں چکرورتی راجہ نہیں کہہ سکتے۔ راون چکرورتی راجہ تھا۔ بڑے بڑے دیوتا اس کی غلامی کرتے تھے۔ آگ اور پانی کے دیوتا بھی اس کے غلام تھے۔ مگر اس کا انجام کیا ہوا؟ غرور نے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ کوئی اسے چلّو پانی تک دینے والا نہ بچا۔ انسان اور چاہے جو برائی کرے۔ غرور کیا اور دین دنیا سے گیا۔ ابلیس کا حال بھی پڑھا ہو گا۔ اُسے بھی غرور ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنّت سے دوزخ میں دھکیل دیا گیا۔ شاہِ روم نے بھی ایک بار غرور کیا تھا۔ بھیک مانگ مانگ کر مر گیا۔ تم نے ابھی صرف ایک درجہ پاس کیا ہے اور ابھی سے سر پھر گیا۔ تب تو تم آگے

بڑھ چکے۔ یہ سمجھ لو تم پاس نہیں ہوئے اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی۔ مگر بٹیر صرف ایک بار ہاتھ لگ سکتی ہے، بار بار نہیں لگ سکتی۔ کبھی کبھی گلی ڈنڈے میں بھی اندھے چوٹ نشانہ پڑ جاتا ہے۔ اس سے کوئی کامیاب کھلاڑی نہیں ہو جاتا۔ کامیاب کھلاڑی وہ ہے جس کا کوئی نشانہ خالی نہ پڑے۔ میرے فیل ہونے پر مت جاؤ۔ میرے درجے میں آؤ گے تو دانتوں پسینہ آجائے گا۔ جب الجبرا اور جامیٹری کے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے اور انگلستان کی تاریخ پڑھنی پڑے گی۔ بادشاہوں کے نام یاد رکھنا آسان سمجھتے ہو؟ ہنری ساتویں کی جگہ ہنری آٹھواں لکھا اور سب نمبر غائب۔ صفر بھی نہ ملے گا، صفر بھی۔ ہوکس خیال میں! درجنوں تو جیمس ہوئے ہیں، درجنوں ولیم، کوڑیوں چارلس، دماغ چکر کھانے لگتا ہے۔ کمبختوں کو نام بھی نہ جڑے تھے۔ ایک ہی نام کے پیچھے دوم، سوم، چہارم، پنجم لگاتے چلے گئے۔ اور جامیٹری تو بس خدا کی پناہ۔ اب ج کی جگہ اج ب لکھ دیا اور سارے نمبر کٹ گئے۔ کوئی ان بے رحم ممتحنوں سے نہیں پوچھتا کہ آخر اب ج اور اج ب میں کیا فرق ہے اور کیوں اس مہمل بات کے لیے طالب علموں کا خون کرتے ہو؟ دال، بھات روٹی اور دال روٹی بھات میں کیا فرق ہے۔ مگر ممتحنوں کو کیا پروا؟ وہ تو وہی دیکھتے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔ چاہتے ہیں کہ سب لڑکے رٹّو ہو جائیں۔ اسی رٹنت کا نام تعلیم رکھ چھوڑا ہے، اور ایسی بے سر پیر کی باتیں پڑھانے سے فائدہ ہی کیا؟ اس خط پر دہ عمود گرا دو تو قاعدہ عمود سے زیادہ ہوگا۔ پوچھیے اس سے کیا مطلب؟ دگنا نہیں چوگنا ہو جائے آٹھ گنا ہو جائے، میری بلا سے، لیکن پڑھنا ہے تو یہ ساری باتیں یاد رکھنی پڑیں گی۔ انگریزی مضامین لکھنے پڑتے ہیں۔ کہہ دیا وقت کی پابندی پر ایک مضمون لکھو جو چار صفحے سے کم نہ ہو۔ اب کاپی کھول کر اس کے نام کو روئیے۔ کون نہیں جانتا کہ وقت کی پابندی اچھی بات ہے، لیکن اس پر چار صفحے کیسے لکھے؟ جو بات ایک جملے میں کہی جا سکے اس کے لیے چار صفحے

لکھنے کی کیا ضرورت ؟ میں تو اسے حماقت کہتا ہوں، مگر نہیں آپ کو چار صفحے لکھنے پڑیں گے، چاہے جیسے لکھیے اور صفحے بھی پورے فل سکیپ سائز کے۔ یہ لڑکوں پر ستم ناروا نہیں ہے تو کیا ہے ؟ ظالم اس پر یہ بھی کہے جاتے ہیں کہ اختصار سے کام لو۔ ایک ذرا سی بات پر تو آپ چار صفحے رنگواتے ہیں اور اس پر فرماتے ہیں کہ اختصار سے بھی کام لو۔ تیز بھی دوڑیے اور آہستہ آہستہ بھی۔ ہے تضاد یا نہیں ؟ بچّہ بھی سمجھ سکتا ہے لیکن ان ماسٹروں کو اتنی بھی تمیز نہیں۔ اس پر دعویٰ ہے کہ ہم ماسٹر ہیں۔ میرے درجے میں آؤ گے تو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ اس درجے میں اوّل آ گئے ہو تو اتنا اتراتے ہو۔ میرا کہنا مانو۔ لاکھ فیل ہو گیا لیکن تم سے بڑا ہوں۔ دنیا کا تم سے زیادہ تجربہ کیا ہے۔ میرا کہنا مانو۔ جو کہتا ہوں اسے گرہ سے باندھ لو۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔

اسکول کا وقت قریب تھا ورنہ خدا جانے یہ نصیحت کب ختم ہوتی ! مجھے آج کھانا بالکل بے مزہ معلوم ہوا۔ جب پاس ہو جانے پر یہ لتاڑ پڑتی ہے تو کہیں فیل ہو جاؤں تو یہ حضرت زندہ ہی نہ چھوڑیں گے۔ انھوں نے اپنے درجے کی پڑھائی کی جو ہیبت ناک تصویر کھینچی تھی۔ اس نے مجھے سچ مچ لرزا دیا۔ کیسے اسکول چھوڑ کر نہیں بھاگا۔ یہی تعجب ہے۔ لیکن یہ سب درگت ہونے پر بھی کتابوں سے میری بے زاری بدستور قائم رہی۔ کھیل کود کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ پڑھتا بھی تھا، مگر بہت کم بس اتنا کہ روز کا کام ختم ہو جائے اور درجے میں ذلیل نہ ہونا پڑے اپنے اوپر جو اعتماد پیدا ہوا تھا، وہ پھر فنا ہو گیا اور پھر چوروں کی سی زندگی بسر ہونے لگی۔

(۳)

پھر سالانہ امتحان ہوا اور کچھ ایسا اتّفاق ہوا کہ میں پھر پاس ہو گیا اور بے پڑھے۔ بھائی صاحب

پھر فیل ہو گئے۔ میں نے محنت زیادہ نہیں کی مگر خدا جانے کیسے درجے میں اوّل آ گیا؟ مجھے خود تعجب ہوا۔ بھائی صاحب نے حیرت انگیز محنت کی تھی۔ دس بجے رات تک، ادھر چار بجے صبح سے، پھر ادھر چھ سے ساڑھے نو تک اسکول جانے کے قبل۔ چہرہ زرد ہو گیا مگر فیل، مجھے ان پر رحم آتا تھا۔ نتیجہ سنایا گیا تو وہ رو پڑے اور میں بھی رونے لگا۔

میرے اور بھائی صاحب کے درمیان اب ایک درجے کا تفاوت رہ گیا تھا۔ میرے دل میں ایک بے ہودہ خیال یہ پیدا ہوا کہ کہیں بھائی صاحب ایک سال اور فیل ہو جائیں تو میں ان کے برابر ہو جاؤں گا۔ پھر کس بنا پر میری فضیحت کر سکیں گے۔ لیکن میں نے اس خیال کو دل سے فوراً نکال دیا۔ آخر وہ مجھے ڈانٹتے ہیں تو میری ہی بھلائی کے لیے۔ مجھے اس وقت ناگوار لگتا ہے ضرور، مگر شاید ان کی تنبیہ کا ہی اثر ہو کہ میں یوں دنادن پاس ہوتا جاتا ہوں اور اتنے اچھے نمبروں سے۔

اب کے بھائی صاحب کچھ نرم پڑ گئے تھے۔ کئی بار مجھے ڈانٹنے کا موقع پا کر بھی صبر و تحمل سے کام لیا۔ شاید اب انھیں خود محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مجاز اب انھیں نہیں رہا۔ یا رہا تو بہت کم۔ میری بدمعاشی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ میں ان کے تحمّل کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگا۔ مجھے ایسا گمان ہوا کہ میں تو پاس ہو ہی جاؤں گا۔ پڑھوں یا نہ پڑھوں۔ میری تقدیر اچھی ہے۔ اس لیے بھائی صاحب کے خوف سے جو تھوڑا بہت کتابیں دیکھ لیا کرتا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ مجھے کنکوے اڑانے کا نیا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور اب زیادہ تر کیا بلکہ سارا وقت اسی مشغلے کی نذر ہوتا تھا۔ پھر بھی میں بھائی صاحب کا ادب کرتا تھا اور ان کی نظر بچا کر کنکوے اڑاتا تھا۔ ساری جزئیات در پردہ عمل میں آتی تھیں۔ میں انھیں یہ گمان کرنے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا کہ بھائی صاحب کی وقعت اور عزّت میری نظروں میں کچھ کم ہو گئی ہے۔

ایک روز شام کے وقت ہاسٹل سے دور میں ایک کنکوا لوٹنے دوڑا جا رہا تھا کہ بھائی صاحب سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ شاید وہ بازار سے لوٹ رہے تھے۔ انھوں نے وہیں میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور مجھے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے: ان بازاری لونڈوں کے ساتھ دھیلے کے کنکوے کے لیے دوڑتے تمھیں شرم نہیں آتی۔ تمھیں اس بات کا بھی کچھ لحاظ نہیں کہ اب نیچی جماعتوں میں نہیں ہو بلکہ آٹھویں جماعت میں آ گئے ہو۔ اور مجھ سے صرف ایک درجہ پیچھے ہو۔ آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ لوگ آٹھواں درجہ پاس کر کے نائب تحصیلدار ہو جاتے تھے۔ میں کتنے ہی مڈلچیوں کو جانتا ہوں جو آج اوّل درجے کے ڈپٹی کلکٹر یا سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ کتنے ہی ہمارے لیڈر ہیں، بی۔ اے۔ ایم۔ اے والے ان کے ماتحت اور ان کے پیرو ہیں اور تم اسی آٹھویں درجے میں آ کر بازاری لونڈوں کے ساتھ کنکوے کے لیے دوڑ رہے ہو۔ افسوس ہے تمھاری اس ناعقلی پر۔ تم ذہین ہو، اس میں شک نہیں، لیکن وہ دھن کس کام کی جس سے آدمی اپنا وقار کھو بیٹھے۔ تم اپنے دل میں سمجھتے ہو گے میں اس سے محض ایک درجہ پیچھے ہوں اور اب اُنھیں مجھ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ میں تمھارے اس خیال کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور چاہے آج تم میری ہی جماعت میں آ جاؤ۔ اور ممتحنوں کا یہی حال ہے تو یقیناً تم اگلے سال میرے ہم جماعت ہو جاؤ گے اور شاید ایک سال بعد مجھ سے آگے نکل جاؤ لیکن مجھ میں اور تم میں جو پانچ سال کا تفاوت ہے اسے تم کیا خدا بھی نہیں مٹا سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ مجھے دنیا اور زندگی کا جو تجربہ ہے تم اس کے برابر کبھی نہیں آ سکو گے۔ چاہے تم ایم۔ اے اور ایل ایل ڈی ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ عقل کتابیں پڑھ لینے ہی سے نہیں آتی۔ ہماری اماں نے کوئی درجہ پاس نہیں کیا اور دادا بھی شاید پانچویں چھٹی جماعت سے آگے

نہیں گئے۔ لیکن ہم دونوں آج ساری دنیا کا علم کیوں نہ پڑھ لیں، امّاں اور دادا کو ہمیں تنبیہ کرنے کا ہمیشہ اختیار رہے گا، محض اس لیے نہیں کہ وہ بزرگ ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ہم سے زیادہ تجربہ کار ہیں اور رہیں گے امریکہ میں کس طرح کی حکومت ہے اور ہنری ہشتم نے کتنی شادیاں کیں اور آسمان میں کتنے ستارے ہیں؟ یہ باتیں انھیں نہ معلوم ہوں لیکن ہزاروں ایسی باتیں ہیں جن کا علم انھیں ہم سے زیادہ ہے۔ آج میں خدانخواستہ بیمار ہو جاؤں تو تمھارے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔ سوائے دادا کے تار دینے کے تمھیں اور کچھ نہ سوجھے گا۔ لیکن تمھاری جگہ دادا ہوں گے تو کسی کو تار نہ دیں گے۔ بلکہ خود مرض کو پہچانیں گے۔ اور خود علاج کریں گے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو کسی ڈاکٹر کو بلائیں گے۔ گھبرائیں گے نہیں، بدحواس نہ ہوں گے، ہمارے خرچ کے لیے وہ جو کچھ بھیجتے ہیں اسے ہم بیس بائیس تاریخ تک خرچ کر کے پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ ناشتہ بند کر دیتے ہیں، دھوبی اور نائی سے منھ چراتے ہیں لیکن آج جتنا ہم اور تم خرچ کر رہے ہیں اس کے نصف میں دادا نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ عزّت اور نیک نامی کے ساتھ بسر کیا ہے اور ایک کنبے کی پرورش کی ہے جس میں سب ملا کر نو آدمی تھے۔ یہ غرور دل سے نکال ڈالو کہ تم میرے قریب آ گئے اور اب خود مختار ہو۔ میرے دیکھتے تم کبھی اپنی زندگی برباد نہ کر پاؤ گے۔ میں جانتا ہوں تمھیں میری باتیں زہر لگ رہی ہیں۔

میں نے ان کی بزرگی کا احساس کرتے ہوئے اپنی ناسعادت مندی پر نادم ہو کر با چشمِ نم کہا: ہرگز نہیں۔ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ معقول ہے اور آپ کو اس کے کہنے کا حق ہے۔ بھائی صاحب نے مجھے شفقت کی نظر سے دیکھا اور مجھے گلے لگا لیا اور بولے میں کنکوے اڑانے کو منع نہیں کرتا۔ میرا جی بھی کبھی کبھی کنکوے اڑانے کو للچاتا ہے۔ کروں کیا، خود بے راہ چلوں تو تمھاری ہدایت کیسے

کروں۔ یہ فرض تو میرے سر پر ہے۔

اتّفاق سے اسی وقت ایک کنکوا ہمارے اوپر سے گزرا۔ اس کی ڈور لٹک رہی تھی۔ بھائی صاحب لمبے تھے۔ اچھل کر اس کی ڈور پکڑ لی اور اُسے لیے ہوئے ہاسٹل کی طرف دوڑے۔ میں پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

کتابیات

(پریم چند کے تفصیلی مطالعہ کے لیے)

۱۔	پریم چند کا تنقیدی مطالعہ		ڈاکٹر قمر رئیس
۲۔	منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے		〃 〃
۳۔	مضامین پریم چند	مرتبہ	〃 〃
۴۔	پریم چند فکر و فن		〃 〃
۵۔	قلم کا مزدور		مدن گوپال
۶۔	پریم چند کے خطوط		〃 〃
۷۔	پریم چند کہانی کار رہنما		ڈاکٹر جعفر رضا
۸۔	پریم چند فن اور تعمیر فن		〃 〃
۹۔	پریم چند کے نسوانی کردار		ڈاکٹر شمیم نکہت
۱۰۔	قلم کا سپاہی (ہندی)		امرت رائے
۱۱۔	پریم چند گھر میں (ہندی)		شورانی دیوی
۱۲۔	منشی پریم چند (انگریزی)		مدن گوپال

پریم چند کی اردو تصانیف

افسانوں کے مجموعے

	پہلی اشاعت
۱ - سوزِ وطن	۱۹۰۸ء
۲ - پریم پچیسی (حصّہ اوّل)	۱۹۱۵ء
۳ - پریم پچیسی (حصّہ دوم)	۱۹۱۸ء
۴ - پریم بتیسی (حصّہ اوّل و دوم)	۱۹۲۰ء
۵ - خاک پروانہ	۱۹۲۸ء
۶ - خواب و خیال	۱۹۲۸ء
۷ - فردوسِ خیال	۱۹۲۹ء
۸ - پریم چالیسی (حصّہ اوّل و دوم)	۱۹۳۰ء
۹ - آخری تحفہ	۱۹۳۴ء
۱۰ - زادِ راہ	۱۹۳۶ء
۱۱ - دودھ کی قیمت	۱۹۳۷ء
۱۲ - واردات	۱۹۳۸ء

ناول

۱- ہم خرما و ہم ثواب	۱۹۰۶ء
۲- کشنا	۱۹۰۷ء
۳- جلوۂ ایثار	۱۹۱۲ء
۴- بازارِ حسن (جلد اوّل و دوم)	۱۹۲۲ء
۵- چوگانِ ہستی (لکھا گیا ۱۹۲۴ء میں)	۱۹۲۷ء (تخمیناً)
۶- گوشۂ عافیت (لکھا گیا ۱۹۲۰ء میں)	۱۹۲۸ء
۷- نرملا	۱۹۲۹ء
۸- غبن (کشنا کا نیا روپ)	۱۹۳۱ء (تخمیناً)
۹- بیوہ (ہم خرما و ہم ثواب کا نیا روپ)	۱۹۳۲ء (تخمیناً)
۱۰- میدانِ عمل (لکھا گیا ۱۹۳۱ء میں)	۱۹۳۵ء
۱۱- گئودان	۱۹۳۸ء

ڈرامے

۱- کربلا	۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۸ء (بالاقساط 'زمانہ' میں شائع ہوا)
۲- روحانی شادی	

بچّوں کا ادب

اچھی چڑیا	محمد شفیع الدین نیرّ	3-00
ادب کسے کہتے ہیں	اطہر پرویز	1-85
اردو کی کہانی احتشام حسین کی کتاب کا مصوّر ایڈیشن	سیّد احتشام حسین	6-25
آرٹ کی کہانی	سیما پرویز	3-25
اکبر الہ آبادی	صغرا مہدی	4-50
ان سے ملیے	منوہر ورما/طلعت عثمانی	3-00
انوکھی کہانیاں	محمد قاسم صدیقی	2-25
انوہا اور کالا کوّا	صالحہ عابد حسین	3-15
اوڈیسی	ہومر/اطہر پرویز	7-00
ایک دن کا بادشاہ	اطہر پرویز	5-50
ایک نائی اور رنگ ساز کا قصّہ	اطہر پرویز	5-00
ایلس حیرت نگر میں	عبدالحئی	8-00
ایلس آئینہ گھر میں	عبدالحئی	8-00